قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸
شمارہ ۳۱

کراچی : ہفتہ - ۳ - ستمبر ۱۹۵۵ء

قیمت چھ آنہ
سالانہ پندرہ روپے

قرآن نے کیا کہا ؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(i) صحیح نظام زندگی میں ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری "اللہ" پر ہوتی ہے۔

(ii) "اللہ" کی یہ ذمہ داری اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس نظام کے پاس از خود تو کچھ ہوتا نہیں جس سے یہ اتنی عظیم ذمہ داری کو پورا کرسکے۔ اس کے لئے معاشرہ کے افراد اس نظام سے ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے افراد اپنی جان اور مال "اللہ" کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں "اللہ" اپنی "جنت" عطا کر دیتا ہے۔ سورہ توبہ میں اس معاہدہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ (۹/۱۱۱) اللہ نے مومنین کا مال اور جان خرید لیا ہے تاکہ انہیں جنت عطا کردے۔ یہ جنت اس زندگی سے شروع ہوجاتی ہے اور اس کا سلسلہ مرنے کے بعد تک مسلسل جاری رہتا ہے۔ مرنے کے بعد، جنت کی کیفیت کیا ہوگی، اسے ہم اسوقت نہیں جان سکتے۔ البتہ اس دنیا میں جنت کی کیفیات ہم سمجھ بھی سکتے ہیں اور ان سے لذت اندوز بھی ہوسکتے ہیں۔ قرآن نے اس جنتی معاشرہ کی تفاصیل بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہیں جن میں سے اہم شقیں آئندہ قسطوں میں سامنے آئیگی۔

ہفتہ وار درس قرآن

ہر اتوار کی صبح نو بجے ۲۳/۱ فاولرز لائن نیپئر بیرکس میں ہوتا ہے جسمیں محترم پرویز صاحب تقریر فرماتے ہیں۔

مقصد طلوعِ اسلام کا مسلک اور

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

1. تنہا عقلِ انسانی (محض) زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے سوا کہیں اور سے راہنمائی نہیں لے سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرم ﷺ [illegible] قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں [illegible] ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. [illegible]
7. [illegible]
8. [illegible] قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد [illegible]

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کیجئے اور طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اے پیر حرم
★ ہمارے لیڈر
★ ہند و استعماریت
★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت
★ مجلس اقبال
★ عورت کا قرآن
★ نصاب زکوۃ میں تبدیلیاں
★ امریکہ میں اسلامیات
★ نقد و نظر
★ حقائق و عبر

سلیم کے نام خطوط

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوئے اسلام اور اس کے سرچشمۂ حیات قرآن ہی سے ہاتھ دھو چلا تھا۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کیگئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ بڑا سائز۔ ضخامت سوا چار سو صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے قلم کا حسین سرقعہ۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک۔

فردوس گم گشتہ

جناب پرویز کے ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ مفہوم کے علاوہ اگر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دینگی۔

بڑا سائز۔ ضخامت قریب چار سو صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید۔ جلد مضبوط۔ گرد پوش حسین۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک۔

اسباب زوال امت

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول کیا ہے اور اسلامی نظام کیسے قائم ہوسکتا ہے؟ اسکے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔ قیمت دو روپے۔

اسلامی معاشرت

مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ، رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے۔

قرآنی دستور

اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔

ضخامت دو سو چوبیس صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ | کراچی۔ ہفتہ ۳ر ستمبر ۱۹۵۵ء | نمبر ۳۱

اے پیرِ حرم ....

۲۰ر اگست کی شام محترم چودھری محمد علی صاحب، وزیر اعظم پاکستان نے سکریٹریٹ کے افسران کے ایک خصوصی اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں بہت سی سبق آموز نصیحتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ ملازمین سرکار کو چاہیئے کہ وہ عوام کے خادم بن کر رہیں، اور حسن انتظام دیانت و امانت کا بلند ترین نمونہ پیش کریں۔ جہاں تک ان نصائح کا تعلق ہے ان کے مواعظ حسنہ ہونے میں کسی کو بھی کلام نہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ محترم چودھری صاحب ہم سے کہیں زیادہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

انھیں اچھی طرح سے علم ہے کہ ان سے پہلے بھی ہر وزیر اعظم ملازمین سرکار سے یہی کچھ کہتا رہا ہے، وزیر اعظم تو ایک طرف، ہر بڑا افسر اپنے سے نچلے افسروں کو یہی کچھ کہتا ہے اور ان مواعظ کو برابر دہراتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود خرابیاں ہیں کہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور اب تو یہ خرابیاں اس حد تک بڑھ چکی ہیں کہ عوام ان کی اصلاح کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان مواعظ کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینے سے (خواہ وہ کیسی ہی حسن نیت سے کیوں نہ کیا جائے) کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ محترم چودھری صاحب کی ساری عمر سکریٹریٹ میں گذری ہے۔ انھوں نے تقسیم سے پہلے ہندو انگریز کے زمانے کی سکریٹریٹ بھی دیکھی تھی اور اب (تقسیم کے بعد) وہ مسلسل پاکستان سکریٹریٹ میں کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے انھیں اچھی طرح سے علم ہونا چاہیئے کہ ان خرابیوں کے علل و اسباب کیا ہیں۔ اور ان کا موثر علاج کیا؟ اس سے پہلے ہو سکتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں ایسے اختیارات نہ ہوں جن سے وہ ان خرابیوں کا استیصال کر سکتے۔ لیکن اب تو وہ حکومت کی اجرائیہ کے سب سے بڑے رکن ہیں۔ اب تو ان کے پاس وہ اختیارات موجود ہیں جن کے استعمال سے ان خرابیوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان سے ہماری گذارش ہے کہ وہ اب ان مواعظ تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے اختیارات کی نوک نشتر سے اس زہر آلود ناسور کا علاج کریں۔ انھیں اچھی طرح سے علم ہوگا کہ دفاتر میں کس قدر سست رفتاری ہے چھوٹے چھوٹے کاموں میں کس قدر تاخیر ہوتی ہے۔ نالائقی (INEFFICIENCY) کس انتہا تک پہنچ چکی ہے۔ ڈسپلن کس قدر بگڑ چکا ہے۔ رشوت کتنی عام ہو رہی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ کوئی ایسی مشینری متعین کی جائے جو ایک ایک افسر اور ایک ایک ماتحت پر کڑی نگاہ رکھے اور مجرمین کو سخت سے سخت سزا دے۔ ہم اہل دفاتر کو جانتے ہیں کہ ان کا دل گردہ کتنا ہوتا ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک رشوت خور افسر کو (کسی ماتحت ملازم کو نہیں بلکہ سب سے بڑے افسر کو) پھانسی کی سزا دیدی جائے اور اس کی جائداد ضبط کر لی جائے تو دوسرے ہی دن سارے سکریٹریٹ سے رشوت ختم ہو جائے گی۔ اگر ایک ایسے سکریٹری کو جس کے دفتر میں کوئی فائل ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ تک رکا ہے برخواست کر دیا جائے تو دیکھئے کہ دفاتری مشینری کس برق رفتاری سے چلنے لگ جاتی ہے۔ باقی رہی نالائقی تو یہ افراد کا نقص نہیں، یہ اس سسٹم کا نقص ہے جس کی رو سے سکریٹریٹ میں افسران اور عملہ کا تعین ہوتا ہے۔ ہم اس وقت اس حقیقت کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتے کہ اس بدترین سسٹم کا ذمہ دار کون ہے؟ (ہم سے زیادہ خود محترم چودھری صاحب اس سے واقف ہیں) اس وقت ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک اس پورے کے پورے سسٹم کو نہیں بدلا جاتا۔ نالائقی کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتی۔ یہ ان تمام نصائح و مواعظ کے باوجود دن بدن بڑھتی جائے گی۔

اندریں حالات ہم محترم چودھری صاحب سے بزور اور باادب گذارش کریں گے کہ اب جبکہ زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے وہ سکریٹریٹ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ یہ خرابیاں مواعظ و نصائح کی حد سے بہت آگے بڑھ چکی ہوئی ہیں۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گران بینی

صوبجاتی تعصب

محترم چودھری صاحب نے سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا وہ یہ تھا کہ ملازمین کو صوبجاتی تعصب سے بہت دور رہنا چاہیئے انھوں نے فرمایا کہ

ایک وقت ایسا آ گیا تھا کہ صوبجاتی تعصب ملک کو تباہی کے جہنم کے کنارے تک لے آیا تھا۔ یہ تعصب الٹی ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد نہ فکر پر ہے نہ منطق پر۔ اسلام کے زوال کا باعث قبائلی لڑائیاں ہوئیں۔ وہی جذبہ اب صوبجاتی عصبیت کی شکل میں کارفرما ہے۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ اگر آپ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو خدا کے لئے اس لعنت سے دور رہیئے۔

ہم اس بیان حقیقت کشا اور بصیرت افروز کے ایک ایک لفظ سے متفق ہیں اور جس زور سے چودھری صاحب نے یہ اپیل کی ہے اس میں بھی ان کے برابر کے شریک ہیں لیکن ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات یہ ہے کہ ملازمین کے طبقہ میں صوبجاتی عصبیت پیدا کرنے اور اسے مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جانے کی بنیادی علت کیا ہے؟ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کوئی شخص کسی خاص صوبے سے وابستہ رہنے کے خیال میں شدت نہیں برتتا۔ تا وقتیکہ اس وابستگی میں اسے کوئی فائدہ نظر نہ آئے۔ صوبجاتی عصبیت، مفاد کے حصول کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بین مثال تقسیم سے پہلے خود مسلمانوں کی آپ بیتی ہے۔ مسلمانان ہند نے ایک عرصہ تک مسلسل جدوجہد جاری رکھی کہ ملازمتوں میں ان کا جداگانہ تناسب ہونا چاہیئے۔ بالآخر ۱۹۳۴ء میں حکومت نے ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ اور اس کے مطابق احکام نافذ کر دیئے۔ ان احکام کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں علیحدگی کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی چلی گئی۔ بعد میں جب ہم نے پاکستان کی تحریک کو اٹھایا تو اس کی بنیاد مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور پر تھی۔ اس لئے ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب کی خلیج نے اس باب میں بھی ہمیں بڑی مدد دی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مسلمان ایک جداگانہ قوم تسلیم کر لئے گئے جو ارباب بصیرت اس زمانہ میں تحریک پاکستان سے وابستہ تھے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے الگ حصہ (QUOTA) نے مسلمانوں کے اندر ایک الگ قومیت کے تصور اور جذبہ کو کس قدر تقویت دی تھی۔ ہندوستان میں تو یہ کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قوموں کے تصور کو شدید سے شدید کیا جائے لیکن بدبختی ملاحظہ ہو کہ ہم نے اس اصول (یعنی ملازمتوں میں صوبجاتی تناسب کے قانون) کو خود پاکستان میں رائج کر دیا۔ چنانچہ اس نے جو نتیجہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا کیا تھا۔ وہی نتیجہ یہاں بنگالی

پنجابی، سندھی، سرحدی بلوچی کے اندر پیدا کر دیا یعنی یہ ایک ملت کے افراد ملازمتی مفاد کی خاطر صوبجاتی تفریق میں بٹ گئے۔ طلوع اسلام چلاتا رہا کہ خدا کے لئے اس شجرۃ الزقوم کے بیج اس سرزمین میں نہ بوؤ۔ اس سے وہ زہریلا پھل پیدا ہوں گے جس سے یہ مملکت تباہیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ لیکن اس نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ یہ لوگ برابر ان خاردار جھاڑیوں کی کاشت میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر دفتر کے اندر صوبجاتی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کا سارا وقت باہمی سازشوں اور دسیسہ کاریوں میں گذرتا ہے۔ نالائقی اس سے بڑھی۔ کام چوری اس سے بڑھی۔ ڈسپلن اس سے خراب ہوا۔ تفرقہ انگیزی اس سے پیدا ہوئی۔ طلوع اسلام ان حضرات سے برابر کہتا رہا کہ جو گرہیں تم آج اپنے ہاتھوں سے لگا رہے ہو ایک وقت آئے گا کہ تم انہیں دانتوں سے بھی کھولنا چاہو گے تو یہ نہ کھلیں گی۔ چنانچہ وہ وقت اب آگیا ہے جو خاردار جھاڑیاں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بوئی تھیں یہ انہیں کے کانٹے ہیں جن سے زخمی شدہ تلوؤں کا واسطہ دلا کر محترم چودھری صاحب اسکریٹریٹ والوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ اپنے راستوں کو ان کانٹوں سے صاف اور اپنے دامن کو ان جھاڑیوں سے محفوظ رکھو۔ ہم محترم چودھری صاحب کے اس جذبہ کی قدر کرتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان جھاڑیوں کو جڑ سے نہ اکھیڑا جائے گا۔ ہمارے راستے کانٹوں سے صاف نہیں ہو سکیں گے۔ ہمیں اس کی توقع ہو چلی تھی کہ اگر مغربی پاکستان ایک وحدت میں تبدیل ہو گیا اور پاکستان کے دونوں بازوؤں کو داخلی خودمختاری مل گئی۔ تو ملازمتوں میں صوبجاتی تناسب کی لعنت دور ہو جائے گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کی وحدت کے علمبردار ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی اعلان کئے جا رہے ہیں کہ ملازمتوں میں مختلف علاقوں کے مفاد کے تحفظ کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی موجودہ جہنم کا یہ شجرۃ الزقوم "جنت" میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی جائے گا۔ انسان بھی کس قدر ظلوم و جہول واقع ہوا ہے!

ان حالات میں ہم محترم چودھری صاحب جیسے بلند پایہ محاسب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ چیز فطرت کے کسی قاعدے کی رو سے ممکن ہے کہ درد اور دوا اپنی اپنی جگہ رہیں لیکن ہماری پُرخلوص اپیلوں اور نیک آرزوؤں سے ان کی حاصل جمع چارہ ہو؟ نیک آرزوؤں سے "ثواب" تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن اصلاح اسی صورت میں ممکن ہے جب خرابیوں کا علاج عملاً کیا جائے۔ یہی ہے وہ مقام جہاں حکیم الامتؒ نے کہا تھا کہ

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دارو کوئی سوچ اُن کی پریشاں نظری کا

اور یہی محترم چودھری صاحب سے ہماری گذارش ہے۔

ہمارے لیڈر!

آپ ایک گھر کا نقشہ سامنے لائیے۔ ایک باپ ایک ماں چند بچے۔ باپ سب کی ضرورت کا کفیل ہے اور ہر چند انکی اپنی ضروریات دوسروں سے کم غیر ضروری ہیں وہ بساط کے مطابق سب کا خیال رکھتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناکافی آمدنی اور بڑھتی ہوئی ضروریات کبھی اس کو محروم رکھتی ہیں کبھی اس کو باپ کبھی ایک سے اگلے ماہ کا وعدہ کرتا ہے کبھی دوسرے سے۔ لیکن گھر کا نظام ہے کہ ایک اطمینان اور ضبط سے چلتا رہتا ہے۔ نہ بچوں میں بددلی پیدا ہوتی ہے نہ باپ میں بدمزگی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی ایک اور صرف ایک وجہ ہے، تجربے نے ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ جب بھی باپ سے بن پڑتا ہے وہ پاس عہد کرتا ہے اور جب وہ کسی کی کسی ضرورت کو ملتوی کرتا ہے تو اس کے لئے ایسی معقول وجہ ہوتی ہے جس سے گھر کا عمومی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ جن گھروں میں اعتماد کی یہ دولت موجود ہوتی ہے وہاں بے زری کے باوجود ناہمواریاں پیدا نہیں ہوتیں اور بخیر و خوبی چلتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں افراد اعتماد باہمی سے محروم ہوتے ہیں وہاں دھن آتا ہے اور دھن جاتا ہے لیکن گھر ڈانواں ڈول ہی رہتا ہے۔

گھر کے اس نقشے کو پھیلائیے تو آپ کے سامنے پوری مملکت آجائے گی۔ اور حقیقت تو یہ ہے مملکت گھر کی وہ وسعت یافتہ شکل ہے جس کی اساس رشتہ خون نہیں بلکہ جذبۂ ائتلاف ہے۔ بغرض سہولت کہئے یا تقسیم کار، مملکت میں ایک ہیئت حاکمہ ہوتی ہے جو کاروبار حکومت چلاتی ہے یہ ہیئت حاکمہ جمہوری قواعد کے مطابق بدلتی رہتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد آئیں اور جائیں لیکن کاروبار حکومت ایسی جوئے رواں کی طرح چلا جائے جو ہزارہا قطروں سے مل کر بنتی ہے ان قطروں میں بعد و اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ ہے حکومت کا اصول۔ جب تک ہیئت حاکمہ اس اصول پر کاربند رہتی ہے کاروبار حکومت سلیقہ اور ضبط سے چلتا رہتا ہے لیکن جب برسر اقتدار طبقہ اپنے آپ کو حکمران سمجھ لیتا ہے اور اپنا مقصد خدمت کی بجائے حکومت تصور کر لیتا ہے تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ افراد آتے ہیں تو جانے کا نام نہیں لیتے۔ گدیوں سے چپکے رہنے کی غرض سے شتومہ کی بدولت وہ ان کو بھی بدنام کرتے ہیں جن کے جانے پر وہ آئے تھے اور ان کو بھی جن کا ان کے بجائے آنے کا امکان ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو مظلوم اور جامع الصفات ثابت کرتے ہیں حالانکہ جب وہ حکومت کی گدیوں میں ہوتے ہیں تو وہ خود وہی کام کرتے ہیں جن کے لئے وہ اپنے رقیبوں کو بدنام کر رہے ہوتے ہیں۔

ہم اس سلسلہ میں اشخاص کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے تھے لیکن ہمارے یہاں سیاست کا یہ انداز ہو گیا کہ ان کا حوالہ دیئے بغیر بیان بامعنی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم جن اشخاص کا ذکر کریں گے وہ بطور حوالہ اور مثال ہوں گے اور اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آئے گا کہ ان کے علاوہ باقی معصوم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست کے حمام میں سبھی ننگے ہیں۔

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ابھی کل کی بات ہے کہ خان عبدالقیوم خان کو مسلم لیگ نے مجلس دستور ساز کی رکنیت کے لئے ٹکٹ نہ دیا۔ خاں صاحب موصوف تقسیم سے پہلے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ سرحد کی مسلم لیگ کے صدر تھے اور صوبے کے وزیر اعلیٰ اور مرکز میں وزیر صنعت ہوئے۔ اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تو بھی وہ مسلم لیگ میں تھے۔ اتنے سال انھوں نے ایک دفعہ بھی مسلم لیگ کی سیاست پر نکتہ چینی نہیں کی نہ مسلم لیگی حکومتوں کے رویوں پر کوئی اعتراض ہی کیا۔ ایسا وہ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا اس میں وہ شریک تھے۔ لہٰذا اس کے لئے ذمہ دار۔ لیکن جونہی انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا گیا تو کیا مسلم لیگ اور کیا مسلم لیگی حکومتیں سب قابل مذمت و نفرت آمریت کے مظاہر بن گئے۔ اور انھوں نے گلی گلی کوچے کوچے لوگوں کو یہ بتانا شروع کیا کہ مسلم لیگ اور اس کی حکومت یہ یہ ہتھکنڈے کرتی ہیں۔ پنجاب میں ملک فیروز خاں نون کو دیکھئے وہ بھی تقسیم سے پہلے مسلم لیگی بن چکے تھے۔ اس کے بعد اب تک جماعتی اور حکومتی طور پر وہ ممتاز جگہوں پر متعین رہے۔ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کے لئے پوری طرح ذمہ دار ہیں۔ لیکن ان کو بھی جب برطرف کیا گیا۔ برطرفی جائز تھی یا ناجائز، یہ علیحدہ بحث ہے۔ اب تو انھوں نے بھی اس گروہ کے عیوب گنوانا شروع کر دیئے جس میں وہ برسوں شریک رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک یونٹ کا آقائی باپ کہلاتے ہیں اس کے باوجود وہ ایک یونٹ کے بل پر اس لئے معترض ہیں کہ یہ ان لوگوں کا مسودہ ہے جو ہر وقت یوں مطلب براری میں لگے رہتے ہیں کہ ان کے بظاہر صحیح الفاظ میں بھی غلط معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر سہروردی کو دیکھئے آپ مسلم لیگ سے نکلے، اس کے مقابلے میں آپ نے عوامی لیگ قائم کی۔

وہ مسلم لیگ پر اکثر اعتراض کرتے رہتے تھے اور یہ بالکل قابل فہم تھا۔ گذشتہ سال حکومت میں تبدیلی آئی تو کچھ رد و کد کے بعد انھوں نے اس میں وزارت قبول کر لی۔ وزارت کے دوران میں انھوں نے اہل بنگال کو ان امور کا قائل کرایا جو ان کے مسلم لیگی شرکائے حکومت کا موقف تھا۔ اور تو اور ایک یونٹ کا مسودہ انھوں نے خود تیار کیا۔ وہ انہی مسلم لیگیوں کی حکومت کے وزیر اعظم تک بننے کے لئے تیار تھے اور اس کے لئے کوشاں بھی رہے۔ لیکن جب معاملہ نہ ہو سکا۔ اس کی ذمہ دار مسلم لیگ تھی۔ یا مسٹر سہروردی یہ غیر متعلق بحث ہے۔ تو انھوں نے مسلم لیگ پر ایسے الزام لگائے کہ اگر وہ صحیح تھے تو آپ کو ایک دن کے لئے وزیر بھی نہیں رہنا چاہئے تھا۔

مشتے نمونہ از خروارے یہ چند امور ہیں جنہیں ہم اس صحبت میں پیش کرتے ہیں۔ اب ان کا تجزیہ کیجئے۔ ان میں ایک قدر مشترک یہ ملتی ہے کہ جب ہمارے لیڈریان حکومت میں ہوتے ہیں تو انھیں کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آتی اور وہ اور ان کے ساتھی جو کچھ کرتے ہیں وہ انہیں حق بجانب ثابت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جونہی مسانید اقتدار ان سے چھنتی ہیں سابقہ حسنات ان کی نظروں میں سیئات بن جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی اس نکتہ چینی کے بعد انہیں پھر سے شریک حکومت کر لیا جائے تو ان کا زاویۂ نگاہ پھر بدل جاتا ہے اور تمام سیئات حسنات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہمیں فی الحال اس سے سروکار نہیں کہ جن مقاصد کو وہ پبلک میں پیش کرتے ہیں وہ موجود ہوتے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی علیحدہ مبحث ہے۔ لیکن قوم پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھنے لگتی ہے کہ جو بھی برسر اقتدار آتا ہے وہ اپنی ہی تعریف کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں

کی بھی۔ لیکن جب اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے تو دوسروں کو جھوٹا بدعہد اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہنا شروع کر دیتا ہے۔ گویا ان میں سچا کوئی بھی نہیں۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ قوم یہ اثر لیتی ہے تو اس پر سیاسی جمود طاری ہو جاتا ہے اور بد دلی پھیل جاتی ہے، اور جب قوم کی قوم بد دلی کا شکار ہو جاتی ہے تو ملک کا اللہ ہی مالک ہوتا ہے۔ آج پاکستان اسی بحران سے دوچار ہے۔ ارباب سیاست پریشان ہیں اور اہل نظر سوچتے ہیں کہ اس مردنی کو کیسے زندگی میں بدلا جائے۔ لیکن وہ اساسی نکتہ کو نہیں سمجھتے کہ جب تک عوام کو اپنے لیڈروں پر اعتماد نہیں ہوگا وہ ان سے تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اعتماد تعاون کی شرط اولین ہے۔

قوم کو بد دلی کے جہنم میں دھکیل کر ارباب سیاست ملک کے مفاد سے جو کھیل رہے ہیں اس کی بدترین مثال جدید مجلس دستور ساز کی کارگزاری ہے۔ اس مجلس کا پہلا اجلاس جولائی کے اوائل میں مری میں منعقد ہوا تھا۔ لیکن اس میں کیا ہوا؟ حزب اختلاف عہد حاضر کی جمہوریت کا لازمہ سمجھا جاتا ہے اور اسے برسراقتدار پارٹی کو خودسر ہونے سے بچانے کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کا مفہوم بالکل اور ہے حزب اختلاف کی اساس پروگرام کے اختلاف پر نہیں بلکہ شخصی مفاد پر ہے۔ ہر وہ شخص جو ایوان حکومت سے نکالا گیا یا اس میں داخل نہیں ہو سکا حزب مخالف کا رکن ہے۔ اس ذہنیت کا "ثبوت" حزب مخالف نے کیا پارٹ ادا کیا؟ مری کے اجلاس میں ان کی تمام تر کوشش یہ رہی کہ اجلاس ملتوی ہو جائے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حکومت نے مری کو مقام انعقاد منتخب کیا تھا، لہٰذا اس کی مخالفت فرض عین تھا۔ چنانچہ بغیر کسی قابل ذکر کارروائی کے اجلاس ملتوی ہو گیا۔ ایک ماہ کے بعد اجلاس کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس سے دو ایک روز پہلے مسٹر سہروردی حزب اختلاف کے لیڈر بن چکے تھے کیونکہ وہ وزیر اعظم نہیں بن سکے تھے۔ انھوں نے بر بنائے محرومی مخالفت کی خاطر مخالفت شروع کر دی اور سیلاب بنگال کو آڑ بنا کر بیس دن کے لئے اجلاس ملتوی کرا لیا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے یہ مطالبہ صرف عوامی لیگ نے کیا حالانکہ ان سے دو گنے متحدہ محاذ کے ارکان مجلس میں موجود تھے اور ان کے گھروں کو بھی ویسا ہی خطرہ تھا جیسا ارکان عوامی لیگ کے گھروں کو تھا۔ دس دن کے التوا کے بعد پھر اجلاس شروع ہوا تو اس میں ایک یونٹ بل پیش ہونا تھا۔ پہلے دن یعنی ۲۳ اگست کو اپوزیشن کے سورماؤں کا سارا زور اس پر صرف ہوا کہ ایک یونٹ کا بل پیش ہی نہ ہو سکے۔

چنانچہ انھوں نے بیکار باتوں اور لچر بحثوں میں ڈیڑھ بجا دیا اور یہ وقت ہوتا ہے دوپہر کے کھانے کے لئے اجلاس ختم ہونے کا۔ لیکن چونکہ اس کے لئے کوئی واضح ضابطہ نہیں تھا۔ اس لئے ایک یونٹ کے حامی اس وقت کے بعد بھی اجلاس جاری رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور عین اس حال میں مسودہ پیش ہوا جبکہ مخالفین کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ انھوں نے اتنا وقت ضائع کر دیا ہے کہ اس دن مسودہ پیش نہیں ہو سکے گا۔

اپوزیشن کا یہ پارٹ بڑا گھناؤنا ہے۔ اول تو ایک یونٹ پر سب پارٹیوں کا اتفاق تھا، اس لئے اس کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر بالفرض ہم مان لیں کہ مسٹر سہروردی اور ان کے ساتھی علیٰ وجہ البصیرت اس کے مخالف ہو گئے ہیں تو پھر ہونا یہ چاہیئے تھا کہ وہ بل کو پیش ہونے دیتے اور دلائل سے اس کی مخالفت کرتے تاکہ ملک یہ جانتا کہ انھیں وحدت مغرب کے خلاف کیا اعتراض ہے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ دلائل و براہین کو انھوں نے دعوے کی بنا نہیں بنایا بلکہ محض دھاندلی سے ـــ بے اختیار غنڈہ گردی کہنے کو جی چاہتا ہے ـــ سے کام لے کر بل کو سرے سے پیش ہونے سے ہی روکنا چاہا۔ وحدت مغرب مفاد ملک کے منافی بھی ہو تو بھی ان اوچھے حربوں سے ملکی مفاد کو تو چھوڑیئے پارلیمانیت کا کوئی بھلا نہیں ہوتا جس کا بھی دم بھرتے ہیں۔

اور یہ کچھ کرنے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں قوم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ ملک کے لئے کم سے کم وقت میں آئین وضع کریں کیونکہ سات طویل سالوں میں آئین مرتب نہ ہو سکنے کی وجہ سے قومی معاملات میں گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ملک ایک عظیم بحران سے دوچار ہو گیا ہے اگر گزشتہ دو ماہ کی کارگذاری کو دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجلس دستور ساز بھی اپنا فریضہ منصبی ادا نہیں کر سکے گی اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ ان نام نہاد آئین سازوں پر سے ملک کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور عام بد دلی پھیلے گی۔ اور دوسرا یہ کہ ملک کا کوئی مسئلہ طے نہیں ہوگا اور اس سے بد دلی کو اور تقویت پہنچے گی پاکستان آج اسی عذاب میں مبتلا ہے اور اس کی ذمہ داری ارباب سیاست پر ہے۔ خواہ وہ حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہوں یا محرومین کے گروہ میں شامل۔ ان حالات میں ملک کا سب سے بڑا محسن وہ ہوگا جو اسے اس دلدل سے نکال کر لے جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چمن میں کوئی ایسا دیدہ ور ہے یا نہیں؟

ہندو استعماریت

گوآ کے بارے میں ہندوستان نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ کسی اعتبار سے معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ طلوع اسلام میں گوآ سے متعلق مضمون میں وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ علاقہ پرتگال کے پاس ہے اور پرتگال اسے اپنا مقبوضہ نہیں بلکہ اپنے ملک کا لاینفک جزو سمجھتا ہے۔ خود گوآ میں اس پوزیشن کو تسلیم کیا جاتا ہے اور پرتگال سے علیحدگی اور ہندوستان سے الحاق کے حق میں وہاں کوئی تحریک موجود نہیں لیکن ہندوستان نے اسے ہڑپ کرنے کے لئے ایک طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ گوآ پر پرتگال کا زیادہ حق ہے یا ہندوستان کا، لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ گوآ کا جو فیصلہ ہو وہ اہل گوآ کی منشا کے مطابق ہونا چاہئے۔ ہندوستان اس کے لئے تیار نہیں اور وہ دھمکیوں سے کام لیکر اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ اس نے ایک حد تک یہ دلیل دینے کی کوشش کی کہ اہل گوآ ہندوستان سے ملنے کے متمنی ہیں لیکن جب دیکھا کہ گوآ میں ایسی تحریک نہیں پائی جاتی تو اس کا استدلال اور رویہ یکسر بدل گیا۔ جب دھمکیوں سے کام نہ نکلا اور پرتگال نے گوآ کا تحفہ رضامندی سے دینے سے انکار کر دیا تو ہندوؤں نے گوآ پر "پرامن" چڑھائی کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان ارادوں کی تکمیل کے لئے ہندوستان کے یوم آزادی کو منتخب کیا جاتا ہے گذشتہ سال بھی ستیہ گرہیوں نے گوآ پر چڑھائی کی تھی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب کہ پھر ستیہ گرہیوں کی فوج تیار ہوئی پنڈت نہرو نے دنیا بھر کو تو یہ یقین دلانا چاہا کہ یہ فوج اہل گوآ پر مشتمل ہوگی لیکن عملاً اس میں گوآ کا شاید ایک فرد بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو نے کانگریسیوں تک کو اجازت دے دی کہ وہ انفرادی حیثیت سے ستیہ گرہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔

۱۵ اگست کو ان سورماؤں نے گوآ پر حملہ کر دیا پرتگال نے مزاحمت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رضاکاروں پر فائرنگ بھی ہوئی اس پر پنڈت نہرو آپے سے باہر ہو گئے اور ایک بیان میں پرتگال پر یہ الزام لگایا کہ اس کی حکومت نے "نہتے اور پرامن" ستیہ گرہیوں پر گولی چلا کے بربریت کا ثبوت دیا۔ "اسے نہ بین الاقوامی قانون جائز تسلیم کرتا ہے نہ کوئی ضابطہ اخلاق"؟ نہتوں پر گولیاں چلانا کتنا ہی انسانیت سوز کیوں نہ ہو پنڈت جی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کی وجہ انھوں نے مہیا کی۔ اگر وہ نہتوں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو نہ وہ غیر ملک پر چڑھ دوڑتے نہ ان پر گولی چلتی۔ آخر یہ کونسے بین الاقوامی قانون یا ضابطہ اخلاق کی رو سے جائز ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ دوسرے ملک پر حملہ کر دیں۔ اسے جارحیت ہی کہا جائیگا عام اس سے کہ حملہ آور غیر مسلح ہی کیوں نہ ہوں۔ گوآ کس کے پاس رہے یہ علیحدہ ہے لیکن اگر پنڈت نہرو اسے اپنے ملک کا حصہ سمجھتے ہیں تو اسے حل کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو بین الاقوامی قانون یا ضابطہ اخلاق کی رو سے جائز ہوں۔ آپ ناجائز بات کی پہل کر کے اپنے حریف پر ناجائز فعل کی ذمہ داری نہیں ڈال سکتے۔ پنڈت نہرو کی ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے مراکش کے مظلومین کی حمایت میں ایک بیان دیا تو اس کے ضمن میں یہ کہنے تک سے دریغ نہ کیا کہ ہم تو مراکش کی حمایت کرتے ہیں لیکن کوئی ایشیائی قوم گوآ میں ہماری حمایت نہیں کرتی۔

پنڈت جی کا دنیا کی رائے عامہ کو اپنے حق میں بنانا قابل فہم ہے لیکن یہ تائید آخر انھیں کسی اصول اور قاعدے کے مطابق حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کا رویہ اس قدر متضاد اور غیر معقول ہو گیا ہے کہ ان کی کہیں سے بھی تائید نہیں ہو رہی۔ جو کچھ وہ گوآ میں کر رہے ہیں اس کا اطلاق کشمیر پر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ گوآ کو اپنا حصہ ملک سمجھتے ہیں تو پاکستان کشمیر کو اپنا جسم گوشت پوست سمجھتا ہے لہٰذا اگر گوآ پر رضاکاروں کی فوجیں بھیج سکتے ہیں اور ان کی مدد کے لئے سرحدوں پر فوجیں متعین کر سکتے تو پاکستان بھی حق بجانب ہے کہ اس طرح کرے۔ کیا پنڈت جی اس کے لئے تیار ہیں کہ پاکستانی رضاکار۔ پرامن اور نہتے۔ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوں؟ پاکستان کے لئے یہ موقع ہے کہ وہ پنڈت جی کے اصول پر کاربند ہو اور کشمیر

(باقی ۱۳ پر)

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کی قومی خصوصیات اور زمانۂ جاہلیت میں ان کی حیاتِ عقلیہ کی کیفیت بیان کی جاچکی ہے۔

عربوں کی حیاتِ عقلیہ کے مظاہر میں سے لغت، زبان شعروشاعری کے بعد ان کی ضرب الامثال سے گفتگو کی جارہی تھی کہ یہ کیونکہ ان کی حیاتِ عقلیہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ضرب الامثال سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔

(۲) زمانہ جاہلیت کی زندگی کے اجتماعی طور طریقوں سے اس امر پر استدلال کیا جائے کہ ضرب المثل جاہلی ہے جیسا کہ ایک ضرب المثل ہے۔ اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی عادت ہے جو جاہلی ہی ہو سکتی اسلامی نہیں ہو سکتی۔

(۳) زیادہ تر امثال اسی قسم کی ہیں جن میں ان کے جمع کرنے والوں نے ضرب المثل کا موقعہ بیان کرتے ہوئے صراحتہً بتا دیا ہے کہ انھیں کسی نے کہا تھا چنانچہ بسا اوقات وہ خود اس قصہ کو بیان کر دیتے ہیں جس کے بارے میں وہ ضرب المثل کہی گئی تھی۔ اس چیز سے ہم استدلال کر سکتے ہیں — اگرچہ یہ استدلال بھی محض تقریبی ہی ہوگا — کہ یہ ضرب المثل کس عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر قصوں کے متعلق یقین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بسا اوقات خود اس قصہ کو دیکھکر یہ انداز ہوتا ہے کہ یہ محض بناوٹی ہے۔ ان لوگوں نے زبردستی ایک زمین تیار کر لی ہے جس پر ضرب المثل منطبق ہو جائے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ جامعینِ امثال زیادہ تر ایک ضرب المثل سے متعلق ایسے مختلف اور متناقض قصے نقل کر دیتے ہیں جن میں تطبیق نہیں دی جا سکتی۔ مزید برآں اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ مختلف قوموں میں عموماً جو ضرب الامثال ملتی ہیں زیادہ تر وہ ایسی ہی ہوتی ہیں جن کے کہنے والوں اور بنانے والوں کا تعین نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ ان ضرب الامثال کے متعلق بھی جو قریبی زمانہ میں کہی گئی ہوں اس قسم کا تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ضرب الامثال چھوٹے چھوٹے جملوں کی صورت میں ہوا کرتی ہیں جو طویل تجربوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں اور یہ ضرب الامثال جب بنائی جاتی ہیں تو وہ اسی وقت سے ضرب الامثال نہیں بن جایا کرتیں بلکہ آگے چلکر ان کا عام طور پر شائع ہو جانا اور زبان زدِ عوام ہو جانا ہی ان کو ضرب المثل بنا دیتا ہے کیونکہ وہ جمہور کے ذوق سے مطابقت رکھتی ہیں۔ عموماً ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ آگے چلکر جب وہ ضرب المثل بن جاتی ہیں تو ان کے بنانے والوں کو لوگ بھول چکے ہوتے ہیں۔

(امر دوم) دشواری کی وجوہ میں سے ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر ضرب الامثال کو جمع کرنے والوں نے حروفِ تہجی کی ترتیب سے ان کو جمع کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے ان ضرب الامثال کو بیان کیا ہے جس کا پہلا حرف "الف" ہے پھر ان کو جن کا پہلا حرف "بار" ہے۔ وقس علی ہذا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کسی مصنف نے ضرب الامثال کو ان کے اصول اجتماعی کے مطابق مرتب نہیں کیا۔ یعنی مثلاً پہلے ان ضرب الامثال کو جمع کیا جاتا جن کا تعلق فقر یا مالداری سے تھا اور پھر ان کو جن کا تعلق عمر اور عمر کے اطوار و حالات سے تھا۔ یا شادی اور خاندان سے تھا۔ پھر ان کو جن کا تعلق عمل اور تجارت، نسیب اور متعلقات، دوستوں اور پڑوسیوں، عورتوں اور اُن کے اخلاق و عادات، صحت اور مرض، وغیرہ سے ہو سکتا تھا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا — جیسا کہ بعض انگریزی مصنفین نے اپنی ضرب الامثال کے ساتھ کیا ہے — تو یہ اپنے موضوع کی حیثیت سے وہ ہمارے لئے بڑے فائدہ کا باعث ہو سکتا تھا۔

عربوں کے اندر زمانۂ جاہلیت میں لقمان کا ذکر بہت عام رہا ہے۔ اسے انھوں نے ایک ایسی شخصیت بنا دیا ہے جو حکمت و عقل کی ایک مثالی نمونہ تھی۔ اس کی طرف بہت سی ضرب الامثال منسوب کی گئی ہیں جن کے کہنے والوں کا نام معلوم نہیں، قرآن کریم میں ایک سورت بھی لقمان کے نام سے منسوب ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ دراصل دو لقمان تھے ایک لقمان حکیم اور دوسرے لقمان عادہ اور عربی ضرب الامثال کا تعلق دونوں ہی سے ہے۔ چنانچہ دوسرے لقمان سے متعلق وہ اس قسم کی ضرب الامثال منسوب کرتے ہیں "اِحْدَىٰ حُظَيَاتِ لُقْمَانَ" اور "أَكَلُ مِنْ لُقْمَانَ" اور اوّل کی طرف منسوب کر کے وہ ان بہت سی حکمت کی باتوں کو بیان کرتے ہیں جو عربوں میں متداول تھیں اور جو کافی اونچے درجے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابن ہشام نے سیرت میں بیان کیا ہے کہ سوید بن الصامت مکۂ معظمہ میں حج کرنے یا عمرہ کرنے کے لئے آئے سوید اپنے قبیلہ میں "کامل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ وہ بہادر، شریف اور صاحب نسب تھا۔ رسول اللہ صلعم نے جب اس کے آنے کے متعلق سنا تو آپ نے اس سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا اور اس کو اللہ اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ سُوید نے آپ سے کہا کہ شاید آپ کے پاس بھی کوئی ایسی ہی چیز ہے جیسی میرے پاس ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کونسی چیز ہے؟ تو اس نے بتایا کہ میرے پاس لقمان کا صحیفہ ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اسے ذرا مجھے دکھاؤ چنانچہ سُوید نے وہ صحیفہ آپ کو دکھایا۔ آپ نے اسے دیکھکر فرمایا کہ اس صحیفہ میں جو کچھ باتیں ہیں وہ اچھی ضرور ہیں مگر میرے پاس جو چیز ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے میرے پاس قرآن کریم ہے جو خدا نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ وہ ہدایت ہے اور نور ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی اور اس کو اسلام کی دعوت دی جسے سنکر وہ اسلام لانے سے باز نہ رہ سکا اور اعتراف کیا کہ واقعی یہ بہترین قول ہے الخ

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۶۵ / ۱)

لیکن اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ لقمان کون تھے؟ ان کی شخصیت کیا تھی؟ ان کی قوم کونسی تھی؟ اور ان کی حکمت اور فلسفہ کس مدنیت کی نمائندگی کرتا تھا؟ اور وہ کس عہد میں گذرے تھے؟ ذرائع علم اب تک اس کی تحقیق نہیں کر سکے۔ لوگوں کے اقوال اس کے بارے میں بڑی شدت کے ساتھ مضطرب و مختلف ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ قومیت کے لحاظ سے نوبی تھے اور ایلہ کے رہنے والے تھے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ وہ حبشی تھے اور کچھ اور لوگوں کا بیان ہے کہ ان کا رنگ سیاہ تھا اور وہ مصری سوڈان کے باشندے تھے۔ وہب بن منبہ کا خیال ہے کہ وہ یہودی تھے اور داؤد علیہ السلام کے بھانجے ہوتے تھے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی تھے اور انہی کے زمانہ میں تھے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ وہ لقمان بن باعورا تھے اور آزر کی اولاد سے تھے جو حضرت ایوبؑ کی بہن یا خالہ کے لڑکے ہوتے تھے۔ لقمان نے طویل زندگی پائی حتیٰ کہ داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا اور ان سے علم حاصل کیا۔ یاقوت نے اپنی معجم میں طبریہ کے مادہ میں لکھا ہے کہ بحیرہ طبریہ کے مشرق میں لقمان حکیم اور ان کے بیٹے کی قبر موجود ہے۔ ان کی ایک قبر یمن میں بھی بیان کی جاتی ہے۔ واللہ اعلم ان میں سے کونسا قول صحیح ہے۔ آمر

بعض لوگ رسول اللہ صلعم کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ سوڈانیوں کے سردار چار آدمی ہیں۔ لقمان، نجاشی، بلال اور مہجع بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوڈان کے کلمہ سے وہ کچھ مراد نہیں ہے جو اصطلاحی طور پر آجکل ہم سمجھتے ہیں بلکہ اس سے مراد سیاہ جنس کے لوگ ہیں۔

بہرحال ان تمام اقوال سے ہم جس نتیجہ تک پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا اسپر تو اتفاق ہے کہ لقمان عربی النسل نہیں تھے انھوں نے کسی دوسری قوم کا فلسفہ اور حکمت ہی عربوں میں داخل کیا تھا۔ بعض اقوال اسکو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ عبرانی حکمت تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لقمان کا لفظ عربوں کا معرب بنایا ہوا ہے انھوں نے بلعم کو معرب کیا ہے اور بلعم بن باعورا ایک مشہور یہودی گذرے ہیں۔ امام مالکؒ نے اپنے مؤطا میں بھی ان کی بہت سی حکمت کی باتیں نقل کی ہیں۔ ان کی تمام قصصی ضرب الامثال ایک کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں جس کا نام "امثال لقمان" ہے۔ اس کی اسلوب کی کمزوری، عبارت کی پستی، نحوی اور صرفی اغلاط کی کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ضرب الامثال من گھڑت ہیں جو قریبی زمانہ ہی میں گھڑی گئی ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کتاب کا نام عربوں کی پرانی کتابوں میں کہیں نہیں آیا۔ بعض محققین نے ان ضرب الامثال میں جو لقمان کی طرف منسوب ہیں اور ان کا قصوں کہانیوں میں جو ایسوپؔ یونانی کی طرف منسوب ہیں مشابہت دیکھتے ہوئے ان کے بارہ میں فرضی نظریات قائم کرنے شروع کر دیئے ہیں جن کے تذکرہ کا یہ محل نہیں ہے۔

تاریخی شواہد

(۲۹)

قوم ثمود کا قصہ یہیں تک ہے لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ آپ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم نے ان حضرات کا یہ قول خصوصیت سے درج کیا ہے کہ: "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے"۔ حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۴۵)

اور میں تم سے (اپنی) اس (رہنمائی و ہدایت) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف تمام جہانوں کے پالنے والے ہی کے ذمہ ہے (اور بس!)

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآن کریم نے یوں بتکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعی الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغِ پیاماتِ الٰہیہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جد و جہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعی الی الحق کے عدیم النظیر کیریکٹر کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ واضح رہے کہ دنیا میں معاوضہ صرف روپیہ کی شکل میں ہی نہیں ہوا کرتا۔ ذرا علم و فضل کی مسندوں۔ زہد و تقویٰ کے آستانوں، وارثانِ ملت کی بارگاہوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کس قدر متنوع شکلیں ہیں جن میں اپنی بے لوث خدمات کا معاوضہ طلب کیا جاتا ہے۔ نذرانہ نہیں تو مخدومیت اور اطاعت، اور اطاعت بھی اکثر اوقات پرستش کی حد تک۔ کبرِ نفس کے تقاضوں کی تسکین۔ انا الموجود لا غیری کے بلند آہنگ دعاوی۔ تنقید کی حد سے ماورائیت۔ اور کم از کم نام کی شہرت۔ جھوٹی عزت۔ اور ان تمام داعیات و اقتضاآت کے باوجود بلا مزد و معاوضہ خدمت کا دعویٰ۔ کتنا بڑا فریب ہے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک حق و صداقت کے داعی کی روش ان سب سے الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر قدم "اللہ کے لئے" اٹھتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا اعلان یہ ہوتا ہے کہ:-

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶/۱۶۳)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہدو۔ میری نماز، میری قربانیاں، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے!

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی اقدام خلوص و صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ اس کا جذبۂ محرکہ خالص للّٰہیت نہ ہو۔ یعنی اس کے صلہ میں محسوس معاوضہ تو ایک طرف، اس قسم کے غیر محسوس رجحانات قلبی و ذہنی کو بھی دخل نہ ہو۔ کام کو اپنا فرض سمجھ کر انجام دیا جائے اور اس پر یقین رکھا جائے کہ جو کام قانونِ خداوندی کے مطابق کیا جائے۔ اس کا معاوضہ اس کے نتائج ہوتے ہیں جو خود اس کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ہے۔ ان اجری الا علی اللہ۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصہ حضرت صالحؑ میں آیا ہے ناقۃ اللہ سے موسوم اور آیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۱/۶۴)

یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے۔ پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے۔ اسے کسی طرح کا نقصان پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب جانکاہ تمہیں آپکڑے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو ناقۃ اللہ کیوں کہا گیا تھا۔ اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اونٹنی عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرقِ عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ سمجھ لینا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی تھی۔ قرآن کے اسلوبِ بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۹/۱۵)

الغرض ہم نے نوح کو اور (اس کے ساتھی) کشتی والوں کو (اس عذابِ غرق سے) محفوظ رکھا۔ اور ہم نے اس کشتی کو جہاں (والوں) کے لئے ایک نشانی بنا دیا تھا۔

حالانکہ وہ عام طریقے کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانۂ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ۔

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (۳/۹۶)

اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ معمارِ حرم علیہ السلام نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح اور مکانوں کی کی جاتی ہے لیکن وہ ملت کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت و حیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے جس طرح قوم ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقۃ اللہ تمہارے کفر و ایمان پرکھنے کی ایک نشانی ہے اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری انابت الی اللہ کی نشانی ہوگی۔ اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار و جحود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملتِ اسلامیہ کی ایمانی قوت و ضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ کی حفاظت کی ہمت رہی تو یہ ان کی ملی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آگیا۔ تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقۃ اللہ کی حفاظت نہ کی۔ اور اللہ کے سوا کن عذاب میں گرفتار ہو گئی۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ (۱۱/۶۶)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا، تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا۔ (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلت و رسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلط ہو گیا۔ اور قوم ثمود کی طرح اس چالیس کروڑ ہجومِ مومنین کی یہ حالت ہو گئی کہ

فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا (۱۱/۶۷-۶۸)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے!

اپنے دیار و امصار میں یوں مُردوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے!

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً (۲۶/۱۵۸)

یقیناً اس کے اندر ایک نشانی ہے۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (۲۶/۱۵۸)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقائق و عبر پر ایمان نہیں رکھتے۔ یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے۔ کسی اور کا قصہ نہیں۔

اسلامی معاشرت
مسلمانوں کے اخلاق و عادات کا خاکہ
قیمت:- دو روپے

عَورت کا قُرآن

(۲۴)

۳ رمضان ۱۳۶۸ھ ۲۹ جون ۱۹۴۹ء روز چہار شنبہ

"شارع عام پر بے جھجک شربت کا دور چلتا ہے اور بے محابا سگریٹ نوشی ہوتی رہتی ہے۔ چھ بجے قہوہ خانے کھلتے ہیں۔ اور سر شام سے شطرنج اور قمار بازی شروع ہو جاتی ہے۔ ریڈیو سے وقفوں کے ساتھ ہر وقت قرآن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے لیکن مخلوق خدا بدستور لہو و لعب میں مشغول رہتی ہے۔ اگر فلسطین میں اس قوم کو ذلت نصیب ہوئی ہے۔ تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ افسوس علماء..... کا قبلہ و کعبہ دستار فضیلت کی دیکھ بھال اور اپنے حلوے مانڈے کی حفاظت ہے اور بس"۔

یکم شوال ۱۳۶۸ھ، ۲۷ جولائی ۱۹۴۹ء روز چہار شنبہ

آج عید ہے۔ میدان میں یہاں نماز نہیں ہوتی۔ یہ سنت بالکل متروک ہو چکی ہے۔ مؤذن نے الصلوٰۃ جامعۃ بلند آواز سے پکارا اور نماز شروع ہو گئی۔ دائیں بائیں سامنے یہی محسوس ہوا کہ کسی کو عید کی نماز نہیں آتی۔ اللہ اکبر! جالندھر اور راولپنڈی سے بدحال پایا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے"۔

جب اسلامی ممالک کے علماء کا یہ انداز اور عوام کی دینداری کا یہ عالم ہو تو پھر ان کے یہاں خلاف قرآن، غلامی کے رائج ہونے میں کیا تعجب کی بات ہے؟ بہرحال! مولانا اسلم جیراجپوری لے آگے جو کچھ فرمایا ہے۔ وہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے خاندان کے آخری بادشاہ، ملک صالح نجم الدین کے عہد کا ایک واقعہ لکھنے کے بعد جس میں مصر کے قاضی شہیر علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے ملک صالح کے ان تمام زرخرید غلاموں کو جو اس عہد میں ترقی کر کے جلیل ملکی و فوجی عہدوں پر قابض و فائز ہو گئے تھے محض اس لئے کہ وہ زرخرید غلام ہیں فروخت کرنے کا اعلان کر کے ملک میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ "غلام" بادشاہ بھی ہو جائے تو چوراہے پر کھڑا کر کے نیلام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان باتوں کا جواب وہ قرآن نہیں ہے کیونکہ اس نے تو "غلامی" کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ رسول اللہ کی زندگی بھی سرتاسر قرآن کے تابع تھی۔ اس کی بھی ایک مختصر کیفیت لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی سیاسی زندگی شروع ہوئی۔ یہاں آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال زندہ رہے۔ اس عرصہ میں چھوٹی بڑی کل لڑائیاں جو پیش آئیں۔ ان کی تعداد ۸۲ ہے۔ ان تمام جنگوں میں مقتولین کی کل تعداد ۱۰۱۸ تھی (۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ مخالفین) اور کل قیدی جو ان لڑائیوں میں مسلمانوں نے قید کئے ۶۵۶۵ تھے۔ ان میں سے چھ ہزار بنی ثقیف اور ہوازان کے لوگ ایک جنگ حنین میں گرفتار ہوئے تھے جو اس کے دوسرے ہی دن بعد احساناً چھوڑ دیئے گئے اور ۴۸۴ قیدی جو مختلف لڑائیوں میں ہاتھ آئے تھے فدیہ لے کر چھوڑ دیئے گئے۔ دو قیدی بوجہ اپنے سابقہ جرائم کے قتل کئے گئے۔ بقیہ ۷۵ جو رہ جاتے ہیں۔ ان کی بابت ٹھیک پتہ نہیں لگ سکا کہ ان میں سے کتنے آزاد کئے گئے اور کتنے اسلام لا کر امت میں شامل ہو گئے"۔

یہ تو عہد رسالت کی بات تھی۔ اسلام کے ابتدائی عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے دور میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے الفاروق (جلد دوم صفحہ ۱۳۸-۱۴۱) میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"جس قدر ممالک ان کے زمانے میں فتح ہوئے۔ اس کی وسعت کئی ہزار میل تھی جس میں کروڑوں آدمی بستے تھے۔ لیکن غلامی کا جہاں جہاں پتہ چلتا ہے وہ نہایت محدود اور گنتی کے مقامات تھے..... عراق اور مصر میں جو بجائے خود مستقل مملکتیں ہیں، باوجود فوج کے اصرار کے ایک شخص بھی غلام نہیں بنایا گیا۔ یہاں تک کہ جب مصر کے بعض دیہات کے آدمی جو مسلمانوں سے لڑے تھے غلام بنا کر عرب میں بھیجے گئے تو حضرت عمرؓ نے سب کو جا بجا سے جمع کر کے مصر کو واپس بھیج دیا کہ ان کو غلام بنانا جائز نہ تھا۔ چنانچہ مو۔ خ مقریزی (جلد اول صفحہ ۱۶۷) نے ان دیہات کے نام اور اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے.....

مناذر میں باوجود اس کے کہ فوج نے اسیران جنگ کو غلام بنا کر ان پر قبضہ کر لیا تھا لیکن حضرت عمرؓ کا حکم پہنچا کہ ان کو چھوڑ دو اور خراج و جزیہ مقرر کر دو۔ حضرت عمرؓ نے ایک اور طریقے سے اس رواج کو گھٹا دیا۔ یعنی یہ قاعدہ قرار دیا کہ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے وہ خریدی اور بیچی نہیں جا سکتی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لونڈی نہیں رہتی.....

اس موقع پر حضرت شہربانو کا قصہ جو غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی چار بیٹیاں بھی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں۔ حضرت عمرؓ نے عام لونڈیوں کی طرح بازار میں ان کو بیچنے کا حکم دیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے منع کیا۔ اور ایک امام حسینؓ کو..... عنایت کی۔ اس غلط قصہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمخشری نے جس کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں، ربیع الابرار میں اس کو لکھا۔ اور ابن خلکان نے امام زین العابدین کے حال میں یہ روایت اس کے حوالہ سے نقل کر دی۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔ اول تو زمخشری کے سوا طبری ابن الاثیر، یعقوبی۔ بلاذری۔ ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا..... تاریخی قرائن بھی اس کے بالکل خلاف ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدگرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو بالکل قابو نہیں حاصل ہوا تھا۔ مدائن کے معرکہ میں یزدگرد مع تمام اہل و عیال کے دارالسلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا پھر..... مرو میں پہنچ کر ۳۰ھ میں، جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ ہے، مارا گیا۔

جس وقت کا یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ کیونکہ جناب ممدوح، ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا۔ اس لئے یہ امر بھی کسی قدر مستبعد ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کی نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی....

اس طور پر مولانا شبلی اس واقعہ کو ہر اعتبار سے غلط بتاتے ہیں جو حضرت شہربانو کے بارے میں محض اس لئے مشہور کر دیا گیا ہے کہ "لونڈی" کا جواز ثابت ہو سکے۔ انھوں نے یہ دکھلانے کے لئے کہ اسلام میں "غلامی" قطعاً ختم ہو چکی ہے اور جنگ کے مواقع پر بھی اجازت نہیں ہے کہ گرفتار کر کے لوگوں کو غلام اور لونڈی بنا لو۔ اور اُن کو "احسان کر کے چھوڑ دینے" کے عوض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "اپنے تصرف میں" لے آؤ۔ ایک اور مشہور تاریخی واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"عمرو بن العاص نے جب مصر پر چڑھائی کی تو..... اتفاق سے مقوقس بادشاہ مصر کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا، یہیں مقیم تھی۔ وہ بھی گرفتار ہوئی تو عمرو بن العاص نے اس کو نہایت عزت و حرمت سے مقوقس کے پاس بھیج دیا"۔

اگر اسلام میں انسانوں کو جنگ کے نتیجے میں پکڑ کر لونڈی اور غلام بنا کر رکھ چھوڑنے کی اجازت تھی تو آنحضرت صلعم نے اپنے عہد کی جنگوں میں ایسا کیوں نہ کیا؟ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اتنی جنگیں ہوئیں انھوں نے کیوں سبھوں کو آزاد کر دیا؟ یہ مقوقس کی بیٹی کیوں چھوڑ دی گئی۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے علماء[1] خدا کے حکم کی تو پروا نہیں کرتے وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ "غلامی" کے بارے میں فقہائے متقدمین کیا فرما گئے ہیں؟

---

[1] ہمارے علماء شاید ان بزرگوں کو متقدمین میں شمار کر کے قابل تقلید نہیں سمجھتے۔

مجلسِ اقبال

اسرارِ خودی

(باب اول ۔ مسلسل)

سابقہ اشاعت میں جو اشعار سامنے آچکے ہیں ۔ انہی کے تسلسل میں حضرت علامہ فرماتے ہیں :۔

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد جز پرستی عقل را تعلیم کرد

خودی ایک کل کا نام ہے یا غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) اس کے نہ حصے کئے جا سکتے ہیں ، اور نہ اسے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اقبال کے نزدیک خودی نے خود ہی اپنے شعلے (FLAME) کو چھوٹی چھوٹی چنگاریوں (SPARKS) میں تقسیم کر دیا ہے اور اس طرح یہ کل مختلف اجزا میں بٹ گیا ہے ۔ اب عقل ان اجزا پر غور و فکر کرتی ہے ۔ اور ان کے متعلق معلومات حاصل کرتی ہے ۔ علامہ اقبال نے دوسری جگہ کہا ہے کہ سائنس حقیقت کے مختلف گوشوں (ASPECTS) کو الگ الگ دیکھتی ہے ۔ لیکن وحی کی نگاہ اس پر تمام ہوتی ہے ۔ یہ چیز سائنس کے بس کی نہیں کہ ان اجزا کے مطالعہ سے کل کے متعلق کسی نتیجہ تک پہنچ سکے لیکن جب وحی کی رُو سے کل کا مطالعہ کیا جائے تو اجزا کا علم خود بخود اس کے اندر آجاتا ہے ۔ اس لئے وحی کی تعلیم کے اندر سائنس کے انکشافات بھی آجاتے ہیں ۔ لیکن سائنس کی تحقیقات ، وحی کی پوری تعلیم کو محیط نہیں ہو سکتی ۔ عقل کا کام جز پرستی ہے ۔ یہ کل کو اپنے احاطہ میں نہیں لا سکتی ۔ مثلاً وقت (TIME) کو لیجئے ۔ اس کی ابتداء اور انتہا کے متعلق انسانی عقل کوئی تصور نہیں کر سکتی ۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے ۔ لیکن جب وقت کو ہم وقفوں (MOMENTS) میں تقسیم کر دیتے ہیں جو طرح گزر گرہیں لگا دی جاتی ہیں ۔ تو یہ وقفے عقل کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں ۔ عقل کی دنیا کا سارا کاروبار ان ہی وقفوں کی بنا پر چلتا ہے ۔ جنہیں ہم سکنڈ ۔ منٹ ۔ گھنٹہ ۔ دن ۔ ہفتے ۔ مہینے ۔ سال ۔ صدیاں کہتے ہیں ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان وقفوں کے متعلق ہمارا علم ، خود وقت (TIME) کے متعلق حقیقت کو نہیں پا سکتا ۔ اس لئے عقل کا کام جز پرستی ہے ۔ کل نگہی نہیں ہے

اس کے بعد وہ خودی کے متعلق کہتے ہیں ۔

خود شکن گردید و اجزا آفرید اندکے آشفت و صحرا آفرید

یہ بھی پہلے شعر کی تشریح ہی ہے ۔ خودی نے اپنی خود شکنی سے اجزا پیدا کئے ۔ اور جب اس نے اپنے آپ پر پریشانی طاری کی تو اس کے ذرات بکھر کر صحرا بن گئے ۔ لیکن

باز از آشفتگی بیزار شد وز بہم پیوستگی کہسار شد

خودی پھر اس تشتت و انتشار سے بیزار ہوئی ۔ اس نے اپنے آپ کو سمیٹا ۔ بکھرے ہوئے ذرات کو یکجا کیا اور ان کے اکٹھا ہونے سے وہ صحرا کوہسار بن گیا ۔ یعنی بکھری ہوئی خودی صحرا بنے اور سمٹی ہوئی پہاڑ ۔

وانمودن خویش را خوئے خودی است خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

کائنات میں یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ خودی اپنی نمود چاہتی ہے ۔ یہ اس کی عادت بن چکی ہے اور کائنات کے ایک ایک ذرہ میں خودی کی قوت پنہاں ہے ۔

قوتِ خاموش و بیتابِ عمل از عمل پابند اسباب عمل

خودی ایک قوتِ خاموش ہے ۔ لیکن عمل کے لئے یکسر بے تاب ۔ وہ ہر پابندی سے آزاد ہے لیکن جب وہ عمل میں آتی ہے تو پھر اسے مختلف اسباب و آئین کا پابند ہونا پڑتا ہے ۔ کیونکہ ان پابندیوں کے بغیر کسی مجرد تصور کا عملی شکل اختیار کرنا نا ممکن ہوتا ہے ۔ لہذا خودی جب اپنے آپ پر پابندیاں عاید کرتی ہے تو وہ مختلف عوامل کی شکل میں سامنے آجاتی ہے ۔ یعنی خودی کو اس قوت خاموش سے عملِ محسوس بننے کے لئے اپنے آپ پر پابندیاں عاید کرنا پڑتی ہیں ۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ

چو حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بقدرِ استواری زندگی است

جب یہ حقیقت ہے کہ اس کائنات کی زندگی خودی کے زور پر ہے تو اس سے یہ واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قدر کسی کی خودی محکم و استوار ہوگی ۔ اسی قدر اس میں زندگی اور استحکام ہوگا ۔ یعنی زندگی کو ناپنے کا پیمانہ خودی کا ضعف اور استحکام ہے ۔

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند

جب ایک قطرہ ناچیز کہ جس میں اتنی قوت بھی نہیں کہ وہ اپنی شکل کو بھی برقرار رکھ سکے ، خودی کے سبق کو ازبر کر لے تو وہ ایک گوہر تابدار بن جاتا ہے اور اس کی سختی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ سخت سے سخت پتھر تک کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے ۔

بادہ از ضعفِ خودی بے پیکر است پیکرش منت پذیر ساغر است

چونکہ شراب کی خودی کمزور ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ اپنی کوئی خاص شکل تک بھی قائم نہیں رکھ سکتی ۔ اسے جس برتن میں ڈالئے اس کی شکل میں ڈھل جاتی ہے ۔ یعنی وہ اپنی صورت بندی کے لئے بھی ساغر کی محتاج ہوتی ہے ۔

گرچہ پیکر می پذیرد جام مے گردش از ما وام گیرد جام مے

ساغر کی خودی شراب کے مقابلہ میں مستحکم ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ شراب کو تو ایک شکل عطا کر دیتا ہے ۔ لیکن اس کی خودی ہمارے مقابلہ میں ضعیف ہوتی ہے ۔ اس لئے ہم اسے جس طرح جی چاہے گردش دیتے رہتے ہیں ۔ وہ اپنی گردش میں بھی خود مختار نہیں ہوتا ۔ اسے وہ ہم سے مستعار لیتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس کی خودی ضعیف ہے ۔ وہ اپنے سے محکم خودی والے کے تابع و مغلوب رہتا ہے ۔

کوہ چوں از خود رود صحرا شود شکوہ سنج جوششِ دریا شود

صحرا کی ریت کیا ہے ؟ یہ پہاڑیاں اور چٹانیں ہیں جو پانی کے زور سے پس پس کر ریت کے ذرے بن جاتی ہیں ۔ دریاؤں کی طغیانی انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور جہاں دریا کی رفتار میں کچھ سکون آجاتا ہے ۔ وہیں یہ ریت زمین پر بیٹھ جاتی ہے ۔ پانی رخ بدل لیتا ہے تو پیچھے کی یہ ریت صحرا بن جاتی ہے ۔ اگر چٹان اپنے وجود میں مستحکم ہے اور پانی کے زور سے ذروں میں تبدیل نہ ہو جائے تو کوئی قوت اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی ۔ یہ اس کی ، پانی کے مقابلہ میں کمزور خودی ہے جو اسے ریت کے ذروں میں تبدیل کر دیتی ہے ۔

موج تا موج است در آغوشِ بحر می کند خود را سوار دوشِ بحر

جب تک موج دریا کے اندر رہتی ہے ۔ وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھتی ہے ۔ اور دریا کے کندھے پر سوار رہتی ہے ۔ لیکن اگر وہ اپنے مقام کو چھوڑ کر دریا سے باہر آجائے تو اسے وہی ریت جذب کر کے نیست و نابود کر دیتی ہے جسے وہ پہاڑوں سے بہا کر اپنے ساتھ لائی تھی ۔ (اس نکتہ کو حضرت علامہ نے رموزِ بے خودی میں وضاحت سے بیان کیا ہے ۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ فرد اپنی خودی کا استحکام جماعت کے اندر رہ کر ہی کر سکتا ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس نکتہ کا صحیح مقام بھی رموزِ بے خودی ہی ہے)

اس سے آگے کہتے ہیں

حلقہ زد نور تا گردید چشم از تلاشِ جلوہ ہا جنبید چشم

حضرت علامہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ خودی عمل کی وجہ سے پابند اسباب عمل ہو جاتی ہے یعنی جب تک وہ قوت خاموش رہتی ہے ، اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی ۔ وہ توانائی محض (ABSOLUTE ENERGY) ہوتی ہے ۔ لیکن جب وہ جوشِ عمل سے بیتاب ہو کر اپنی نمود چاہتی ہے تو پھر اسے کوئی نہ کوئی پیکر اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ یہی پیکر اس کے استحکام کا موجب بنتا ہے ۔ اگر وہ اس پیکر کو چھوڑ دے تو پھر توانائی محض رہ جاتی ہے ۔ اسی خیال کی تائید میں انہوں نے پہلے موج کی تشبیہ بیان کی تھی ۔ اور اب اس سے بھی لطیف تشبیہ سامنے لائے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ روشنی جب اپنے آپ کو ایک دائرے کے اندر محدود و محصور کر لیتی ہے تو اسے آنکھ کہا جاتا ہے اور پھر یہ آنکھ صحنِ کائنات میں مختلف جلووں کی تلاش میں مصروف جنبش رہتی ہے ۔ یعنی آنکھ کی ہستی اور اس کی حرکت اس بنا پر ہے کہ روشنی نے اپنی بیتابیٔ عمل کی بنا پر اپنے اوپر پابندیاں عاید کیں اور ایک پیکر میں محصور ہو گئی ۔

امریکہ میں عربی زبان اور اسلامیات کی تعلیم

پروفیسر فلپ ہٹی دور حاضر کے ایک ممتاز مستشرق ہیں۔ ان کی تصنیفات، بالخصوص تاریخ عرب اور تاریخ شام دنیائے علم میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ یہ آجکل پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اپنے زیر نظر مضمون میں، جو پاکستان کوارٹرلی میں، انگریزی زبان میں چھپا ہے، یہ بتایا ہے کہ امریکہ میں اسلامیات کے مطالعہ کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اسوقت کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہم اس مضمون کا آزاد ترجمہ اسلئے شائع کر رہے ہیں کہ ایک تو قارئین طلوع اسلام کو معلوم ہو جائے کہ اس باب میں امریکہ کا رخ کس سمت کو ہے اور اس کے بعد چند الفاظ میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ وہ کس قسم کا اسلام ہے جس کے مطالعہ کا ذوق ان ممالک میں اس انداز سے بڑھ رہا ہے۔ (طلوع اسلام)

امریکہ میں مشرق وسطی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ذوق اس وجہ سے پیدا ہوا کہ امریکہ کی آبادی کا بیشتر حصہ عیسائیوں پر مشتمل ہے اور ان لوگوں کو بہرحال بائبل، عیسائیت اور یہودیت سے دلچسپی ہے۔ لہذا کچھ عرصہ پہلے تک اس باب میں ان کی توجہ صرف عبرانی زبان اور اس سے ملحقہ مضامین پر ہی مرکوز رہی .... یورپ میں بھی ان علوم سے دلچسپی کا آغاز انہی وجوہات کی بنا پر ہوا لیکن کچھ وقت کے بعد ان میں ایک سیاسی مقصد کا بھی اضافہ ہو گیا۔ انگلستان، فرانس، حتی کہ جرمنی، اٹلی اور اسپین جیسے استعماریت پسند ممالک کے سیاسی مقاصد کا تقاضہ تھا کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں مسلمانوں سے متعلق علوم کو نصاب میں داخل کریں تاکہ انکے وہ طلبا جنھوں نے بعد میں ان اسلامی ممالک میں جا کر حکومت کرنا تھا پہلے ہی سے ان علوم سے آشنا ہو جائیں۔ یاد رہے کہ ان ممالک کی یونیورسٹیوں پر حکومت کا پورا پورا کنٹرول تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر امریکہ میں اسلامیات اور عربی زبان کے مطالعہ کا ذوق بہت دیر میں جا کر شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں تو امریکہ بھر میں صرف ایک استاد تھا جس نے عربی کا کورس لیا۔ یہ اسوقت اس یونیورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر تھا۔ اس سے پہلے جو لوگ عربی زبان کا کورس لیتے تھے وہ اس غرض سے ہوتا تھا کہ اس سے انھیں عبرانی یا دیگر سامی زبانیں سیکھنے میں مدد ملتی تھی۔ بالفاظ دیگر وہاں سامی زبانوں کے اسکالرز تو ہوتے تھے جسے عربی کا اسکالر کہا جائے وہ کوئی نہیں ملتا تھا۔ جہاں تک ترکی اور فارسی کا تعلق ہے، اسکا تو وہاں وجود تک نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسلامی کلچر جسکا شمار دنیا کے ممتاز ترین چھ کلچرز میں ہوتا ہے، اہل امریکہ کے لئے بالکل ایک مدفون خزانہ کی شکل میں رہا۔ گذشتہ جنگ عظیم تک بھی یہ حالت تھی کہ امریکہ کی صرف دس یونیورسٹیوں نے عربی زبان کو اپنے نصاب میں داخل کیا اور وہ بھی صرف گریجویٹ کی سطح پر۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عربی کے علاوہ باقی سامی زبانیں اب قریباً قریباً مردہ زبانیں ہو چکی ہیں ان کے الفاظ اور لٹریچر بہت محدود ہیں۔ اور یہی چیز ان زبانوں کو سہل الحصول بنا دیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں عربی زبان کی لغت کی وسعت، اس کی صرف و نحو کی نزاکت، اسکے ادب میں تنوع اور اس کی وہ نشوونما جو اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں حاصل کی ہے، اس زبان کو مشکل بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے طالب علم اسکی طرف آسانی سے رخ نہیں کرتے۔ جہانتک ایک ممتاز ثقافت کے حامل ہونے کا تعلق ہے، عربی کا شمار چینی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں ہو سکتا ہے۔ ادب میں تو یہ زبان انیسویں صدی کے شروع تک انگریزی سے بھی آگے تھی آجکل البتہ انگریزی زبان اس باب میں دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے آگے ہے۔

مغربی ممالک میں اسلامیات اور عربی زبان کے زیادہ ترویج نہ پانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے باشندوں کو اسلام کے خلاف تعصب تھا۔ یہ تعصب صلیبی لڑائیوں کے وقت سے متوارث چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کے لوگوں کو اپنے نسلی تفوق اور ذہنی برتری پر اس قدر فخر رہا ہے کہ وہ اپنے اینگلوسکسن کلچر کے سوا دوسرے لوگوں کے علم اور کلچر کے مطالعہ کو بنگاہ حقارت دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس راستہ میں اس قسم کی بھی رکاوٹیں رہی ہیں۔ مثلاً عربی کی ترجمہ شدہ اچھی کتابوں کا نہ ملنا یا اس کے علما کا مغرب سے ذاتی ربط پیدا نہ کرنا وغیرہ۔ یہ وجوہات تھے جن کی بنا پر امریکہ کی تاریخ میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جب عربی زبان یا اسلامیات کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے امریکہ کو خواہ مخواہ ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جس سے اس کے حصہ میں بہت بڑی ذمہ داری اور قیادت اقوام کا منصب آ گیا۔ حالانکہ امریکہ اس کے لئے تیار نہ تھا۔ یوں سمجھئے جیسے راتوں رات ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جس کی رو سے امریکہ کو ضرورت پڑی کہ وہ دیگر اقوام کے خیالات اور نفسیات سے واقف ہو۔ بالخصوص مسلمانوں کے تہذیب و تمدن اور روایات سے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جنگ کے دوران ہی میں اس ملک کی یونیورسٹیوں میں نہ صرف عربی بلکہ ترکی اور فارسی زبانوں کو نصاب میں داخل کیا گیا۔ اسوقت سے امریکہ میں شعوری طور پر اس ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ یہاں کے لوگ اسلامیات کے مختلف گوشوں سے تعارف پیدا کریں اور اسلامی ثقافت و تمدن کا مطالعہ کریں۔ نیز ان مسائل کا بھی جو عالم اسلام میں آجکل پیدا ہو رہے ہیں۔

اس باب میں پہلا قدم پرنسٹن یونیورسٹی نے اٹھایا۔ اس نے ۱۹۴۷ء میں اپنے شعبہ مشرقیات میں عربی، ترکی اور فارسی کو بطور نصاب داخل کیا اور اسے "انڈر گریجویٹ طالبعلموں" کے لئے بھی کھلا رکھا حالانکہ اس سے پہلے صرف گریجویٹ طالبعلم ہی ان تک رسائی حاصل کر سکتے تھے چنانچہ اس طرح مسلمانوں کی تین بڑی زبانیں اور ان کے ذریعے حاصل کردہ اسلامی کلچر، اس یونیورسٹی کے جدید پروگرام کا محور بن گیا۔ اس کے علاوہ عمرانیات، اقتصادیات، سیاسیات نیز اسلامی آرٹ اور فلسفہ کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔ پرنسٹن یونیورسٹی کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس کی لائبریری میں ہزار سے زیادہ عربی مخطوطات ہیں۔ اس کے مطبع میں عربی کی مونوٹائپ مشین موجود ہے جس پر بہت سی کتابیں چھاپی جا چکی ہیں ان میں "اسلام کے تاریخی اٹلس" کو خاص مقام حاصل ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کا اندازہ ہے کہ تیس یا چالیس لاکھ ڈالر کے تازہ سرمایہ سے ان کا پیش نظر پروگرام توازن سے ترقی کر سکیگا۔ پرنسٹن کے بعد مچگین کی یونیورسٹی نے اس کی اتباع کی پھر ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں نے بھی اسے اپنایا۔ ازاں بعد اس حلقہ میں کیلیفورنیا اور لاس انجلس کی یونیورسٹیاں بھی شامل ہو گئیں۔ کنیڈا میں میک گل یونیورسٹی نے تین سال ہوئے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس میں مذہب اسلام کے متعلق خاص طور پر تحقیقات کی جاتی ہیں۔

اس تمام پروگرام کی بنیادی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ عربی زبان کو محور قرار دیکر ترکی اور فارسی کو اس کے ملحقات میں شامل کر لیا جائے۔ افسوس ہے کہ اس زمرہ میں اردو کو شامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ وہ اہل اسلام کی ممتاز زبانوں میں سے ایک ہے۔

امریکہ میں اسلامیات سے اسقدر دلچسپی کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرق قریب اور مشرق وسطی کے بہت سے طالب علم ان علوم میں ریسرچ کے لئے اب امریکہ کا رخ کرنے لگ گئے ہیں۔ امریکہ میں ان علوم کے متعلق ریسرچ، یورپ کے مقابلہ میں زیادہ غیر جانبدارانہ طریقہ سے ہو سکیگی، اسلئے کہ اہل یورپ کے اہل مشرق کے ساتھ جو روابط رہے ہیں ان کی وجہ سے ان کے باہمی تعلقات ایسے خوشگوار نہیں رہے۔ ریاستہائے متحدہ کے متعلق یہ عام طور پر معلوم ہے کہ اس کے سامنے استعماریت کا کوئی تصور نہیں۔ اس کے علاوہ استنبول، بیروت، قاہرہ، اور مغربی اور جنوبی ایشا میں مختلف مراکز میں امریکہ کے ایسے ادارے موجود ہیں جن کے ذریعے باہمی روابط قائم کئے جا سکتے ہیں نیز راک فیلر اور کارنیگی فاونڈیشنز کے بعد عرب ممالک میں امریکی تیل کی کمپنیاں بھی اس مقصد کے لئے بہت کچھ کر رہی ہیں۔ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب کہ امریکہ کی کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہو گی جس میں اسلامیات سے متعلق تعلیم اور ریسرچ کے مواقع و اسباب موجود نہ ہوں۔ جن میں یہ کچھ نہیں ہو گا وہ اپنے آپ کو قابل فخر قرار نہیں دے سکیں گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاستہائے متحدہ میں اس قسم کے مراکز جن میں اسلامیات سے متعلق تعلیم اور تحقیقات کے اسباب و ذرائع پورے پورے

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

نصابِ زکوٰۃ میں تبدیلیاں

مختلف ادوارِ خلافت میں:-

محمد ابو العلا البنّا مدرس فلکیات کلیۂ شریعت مصر

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ

(۱) قرآنی اصولوں کی جو جزئیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائی تھیں اگر ان میں سے کسی میں زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو وہ تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ لیکن

(۲) یہ تبدیلی صرف وہ اسلامی نظام کر سکتا ہے جو علیٰ منہاجِ نبوت، قرآنی حکومت کے قیام کے لئے وجود میں آئے۔ ہمیں یا آپ میں سے کسی فرد کو اس تبدیلی کا حق نہیں ہے۔ اور

(۳) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اور وہ ایسی تبدیلی نہ کرے اس وقت تک ان احکام میں کوئی رد و بدل نہیں کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام جس تبدیلی کے جواز کا قائل ہے اس سے زیادہ تر ہمارے معاشی اور معاشرتی حالات ہی متاثر ہوں گے۔ کیونکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کا زیادہ تر اثر انہی پر پڑیگا۔ مثلاً زکوٰۃ کی شرح اور نصاب رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک میں اڑھائی فی صدی مقرر کی گئی تھی۔ اگر وہ نظام جو علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو، یہ دیکھے کہ اس شرح یا نصاب سے ہمارے زمانے میں کام نہیں چل سکتا تو وہ اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ مگر طلوعِ اسلام کا یہ جرم اتنا بڑا جرم سمجھا گیا کہ اسے آئے دن مطعون کیا جاتا رہتا ہے۔ کوئی اسے منکرِ حدیث کہتا ہے اور کوئی اسے منکرِ رسالت۔ حالانکہ طلوعِ اسلام نہ منکرِ حدیث ہے نہ منکرِ رسالت۔ وہ صرف اس چیز کا مطالبہ کرتا ہے جو خود رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں ہوتا چلا آیا ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں خود اس عہدِ برکت عہد میں بھی اس قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب یعنی سات تولہ سونا اور ساڑھے باون تولہ چاندی ایک ایسا مقررہ نصاب مانا جاتا ہے جس میں کسی تبدیلی کا تصور تک بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ آج کی فرصت میں ہم محترم محمد ابو العلا البنّا مدرس فلکیات کلیۂ شریعت مصر کے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو مجلہ الازہر بابت ماہ شوال ۱۳۷۴ھ میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے اس مضمون میں خالص علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کر کے بتایا ہے کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ کے نصاب میں مختلف ادوار میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور آج جو نصاب ہمارے ہاں رائج ہے وہ دراصل جنابِ رسول اللہ صلعم کا متعین فرمودہ نہیں بلکہ حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق کے مشورہ سے خلیفۂ اموی عبد الملک کا متعین کردہ نصاب ہے۔

طلوعِ اسلام

مجلہ "الازہر" کے رجب کے پرچہ میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب میں کون کون سے اوزان، سکے اور پیمانے رائج اور مستعمل تھے۔ وہاں ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ تمام اوزان، سکے اور پیمانے مختلف حکومتوں مصر، شام اور ایران کے بنائے ہوئے تھے۔ عرب کی حکومتوں نے انھیں نہیں بنایا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے عربوں کے لئے ان کے استعمال کو برقرار رکھا جیسا کہ اس نے ہر قوم کے لئے اس کے عرف کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن یہ برقراری قطعاً نہیں تھی بلکہ صرف لوگوں کے باہمی معاملات تک ہی محدود تھی۔

جہاں تک حقوق اللہ کا تعلق ہے۔ مثلاً نصاب ہائے زکوٰۃ، دیات، کفارات تو شارع نے ان کی وصولی کے لئے پیمانوں میں اہلِ مدینہ کے عرف کو اور نقود اور اوزان میں اہلِ مکہ کے عرف کو معیار تسلیم کیا ہے۔

ہم نے اس سلسلہ میں کلام کرتے ہوئے گرام کے وزن کو بنیاد قرار دیا ہے جو آج تمام دنیا میں معروف ہے۔ گرام جو صاف پانی کے مکعب سنٹیمیٹر کے وزن کے مساوی ہوتا ہے تاکہ ان شرعی اندازوں کو جس وزن یا جس سکہ یا جس پیمانہ میں سہولت کے ساتھ منتقل کیا جا سکے خواہ وہ کسی حکومت کا بھی کیوں نہ ہو کیونکہ پانی کا وزن اور حجم کسی زمانہ اور کسی مقام پر مختلف نہیں ہوتا برخلاف گیہوں، جو، مسور یا رائی کے دانوں کے کہ وہ نہ صحیح طور پر وزن کو محفوظ کر سکتے ہیں نہ وزن کو۔

اب ہم ان اوزان، سکوں اور پیمانوں کو بیان کریں گے جو رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کے عہدِ خلافت میں معاملاتِ شرعیہ کے اندازوں کے لئے اختیار کئے جاتے تھے اور امیر المؤمنین عمر بن خطاب اور امیر معاویہ اور عبد الملک کے عہدِ خلافت میں جو کمی بیشی کی گئی اور جس پر آئمہ اربعہ کی رائے قائم ہو گئی اور جس پر آج تک یعنی ۱۳۷۴ھ تک برابر عمل ہوتا آ رہا ہے۔ محدثین، مورخین اور فقہاء کی تمام روایتیں اس امر پر متفق ہیں کہ چاندی کا نصاب جس میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے ان مشہور ترین درہموں سے شمار کر کے پورا کیا جائیگا جو نبوت کے عہد میں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں زیادہ تر مستعمل تھے۔ ساتھ ہی تمام روایات اس امر پر بھی متفق ہیں کہ اس عہد میں مشہور ترین درہمی سکے دو قسم کے تھے، ایک چھوٹا درہم ہوتا تھا (جس کا وزن چار دانق ہوا کرتا تھا) اور دوسرا بڑا درہم تھا (جس کا وزن آٹھ دانق ہوا کرتا تھا) اگرچہ بعض روایتوں میں ایک تیسری قسم کا درہم بھی بیان ہوا ہے جس کا وزن چھ دانق ہوتا تھا۔ مگر یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں کیونکہ چھ دانق والا درہم دونوں گذشتہ درہموں کے درمیانی وزن کا درہم ہے اور گذشتہ دونوں درہم سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔

اس کے بعد جن امور میں روایات واقعی طور پر مختلف ہوئی ہیں وہ امور یہ ہیں۔

(۱) نصابِ زکوٰۃ (یعنی دو سو درہم) کیا صرف چھوٹے درہم سے کیا جاتا تھا۔ یا محض بڑے درہم سے شمار کیا جاتا تھا اور کیا اس کا انحصار زکوٰۃ وصول کنندگاں کی صوابدید پر ہوا کرتا تھا؟

(۲) یا دونوں قسم کے درہموں سے شمار کی جاتی تھی کہ آدھے چھوٹے درہم شمار کئے جاتے ہوں اور آدھے بڑے درہم۔ یا تینوں قسم کے درہموں سے شمار کی جاتی تھی کہ ایک تہائی چھوٹے درہم اور ایک تہائی درمیانی درہم اور ایک تہائی بڑے درہم شمار کر لئے جاتے ہوں۔

ان سوالات کا جواب (جس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب صحیح بھی نہیں ہو سکتا) یہ ہے کہ روایات میں دونوں طریقے موجود ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری عہد تک معمول بہا تھے اور اس کا انحصار وصول کنندگان کی صوابدید پر ہوا کرتا تھا۔ کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان دراہم میں سے کوئی سا ایک درہم عملِ زکوٰۃ میں مخصوص تھا تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے آخری عہد میں صرف دوسرے طریقہ پر عمل کرنے کو متعین کر دیا جس کا حاصل یہ ہے حضرت عمرؓ نے درمیانی درہم کو نصابِ زکوٰۃ یعنی دو سو درہم کو شمار کرنے کا معیار قرار دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زکوٰۃ کے درہم کا وزن حضرت عمرؓ کی آخری خلافت اور حضرت عثمانؓ کی تمام مدتِ خلافت میں چھ دانق یعنی (۲ء۸۳۲ گرام) تھا۔ جیسا کہ روایات اور مختلف عجائب خانوں کے پرانے قدیم سکوں کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ یہ وزن ہم نے اسلئے متعین کیا ہے کہ روایات میں دانق سے مراد پرانا رومانی دانق ہے جس کا وزن (۰ء۴۷۲ گرام) ہوتا تھا اس بنا پر ان تینوں درہم کا وزن حسبِ ذیل ہوتا تھا۔

۸ × ۴۷۲	۳ء۷۷۶ گرام
۴ × ۰ء۴۷۲	۱ء۸۸۸ گرام
۶ × ۰ء۴۷۲	۲ء۸۳۲ گرام

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے ان تینوں مروجہ درہموں میں سے درمیانی وزن کے درہم کو عملی یکسانیت پیدا کرنے کے لئے معیار قرار دیدیا تھا۔ یعنی آخری درہم کو جو چھ دانق کا ہوا کرتا تھا رسول اللہ صلعم نے اپنی زندگی میں اسکی تعیین وصول کنندگانِ زکوٰۃ کی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی لہٰذا یہ تصرف رسول اللہ صلعم کے طرزِ عمل کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صدقات کے مطلق امر کو ایک متعین صورت میں منحصر کر دیا۔

آئندہ نقشہ سے اسکی وضاحت ہو جاتی ہے کہ زمانۂ تشریع میں مشہور ترین درہمی سکے کونسے تھے جو شرعی معاملات کا اندازہ کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہوں۔ ایسے ہی وہ وحدتیں کون کون سی تھیں جن سے یہ سکے مرکب ہوتے تھے۔ اس نقشہ میں ہم نے خلفائے راشدین کے آخری عہد تک کے سکوں کے اوزان دئیے ہیں۔ اور سب سکوں کے اوزان گرام کے مطابق دئیے گئے ہیں۔

سکہ جاتی مشہور درہم اوزان کی وحدتیں جو آخری عہد خلفائے راشدین تک عربوں میں رائج تھیں

سکوں کے نام اور اوزان	گرام میں وزن	نسبتیں: حبہ عبری قدیم	حبہ رومانی قدیم	حبہ عبری جدید	قیراط رومانی قدیم	قیراط رومانی جدید	دانق رومانی قدیم	درہم طبری عتیق	درہم طبری نیرونی	نغلی درہم صغیر
درہم بغلی صغیر	۳٫۰۷۷۶	۸۵ ۱/۳	۸۰	۶۴	۲۰	۱۹٫۲	۸	۲	۱ ۱/۳	۱
درہم طبری نیرونی	۲٫۸۳۲	۶۴	۶۰	۴۸	۱۵	۱۴٫۴	۶	۱ ۱/۲	۱	
درہم طبری عتیق	۱٫۸۸۸	۴۲ ۲/۳	۴۰	۳۲	۱۰	۹٫۶	۴	۱		
دانق رومانی قدیم	۰٫۴۷۲	۱۰ ۲/۳	۱۰	۸	۲ ۱/۵	۲٫۴	۱			
قیراط رومانی جدید	۰٫۱۹۶۷	۴ ۴/۹	۴ ۱/۶	۳ ۱/۳	۱ ۱/۲۴	۱				
قیراط رومانی قدیم	۰٫۱۸۸۸	۴ ۴/۱۰	۴	۳ ۱/۵	۱					
حبہ عبری جدید	۰٫۰۵۹	۱ ۱/۳	۱ ۱/۴	۱						
حبہ رومانی قدیم	۰٫۰۴۷۲	۱ ۱/۱۵	۱							
حبہ عبری قدیم	۰٫۰۴۲۵	۱								

پھر امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں زیاد نے ان کو مشورہ دیا کہ درہم کے وزن میں زیادتی کر دی جائے چنانچہ اس نے درہم میں (۲٫۸۵ گرام) تک زیادتی کر دی۔ زیاد کا مشورہ امیر معاویہؓ کو یہ بھی تھا کہ ایک درہم کو چھ دانق کا کر دیں اور ہر دانق (۰٫۴۹۲ گرام) کا کر دیا جائے۔ یہ نئے رومانی دانق کا وزن تھا۔ چنانچہ زیاد نے کوفہ میں ایک درہم بنوایا جو حضرت عمرؓ کے درہم کے ۲۵/۲۴ کی نسبت سے برابر تھا۔ چنانچہ اس کا وزن $\frac{2.832 \times 25}{24}$ = ۲٫۹۵۰ گرام تھا۔

پھر عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج نے اسکو مشورہ دیا کہ زیاد کے عمول کو برقرار رکھو چنانچہ اس نے درہم کا وزن (۶ × ۰٫۴۹۲) = ۲٫۹۵۲ گرام قرار دیدیا جبکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ۲٫۸۳۲ × ۲ = ۵٫۶۶۴ گرام ہوتا تھا۔ اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ۲٫۸۵ × ۲ = ۵٫۷۰ گرام تھا۔

پھر عبدالملک نے سختی کے ساتھ یہ حکم نافذ کر دیا کہ لوگ باہمی معاملات میں اسی وزن کی پیروی کریں جو اس نے مقرر کر دیا ہے اور پورے اموی اور عباسی دور خلافت میں برابر اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ فقہ کے چاروں اماموں نے بھی اسی سے اتفاق کیا اور اسی کے مطابق آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

سب سے اہم ترین چیز جو ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے یہ ہے کہ اوزان کی وہ وحدتیں جو عربوں میں خلفائے راشدین کے آخری زمانہ تک رائج اور مستعمل تھیں وہ قدیم رومی نظام کی وحدتیں تھیں لیکن بنو امیہ نے اپنے دور میں جن وحدتوں کو استعمال کیا ہے۔ وہ رومی جدید اور رومی قدیم دونوں وحدتوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھیں نیز ان وحدتوں سے پیدا ہوئی تھیں جنھیں انھوں نے نظام جدید سے حاصل کیا تھا۔ مندرجہ ذیل دونوں نقشوں سے یہ بات ذہن نشین ہو سکے گی۔

(رومی نظام قدیم)

اوزان اور سکوں کے نام	گرام میں وزن	حبہ میں وزن
مثقال دینار	۴٫۲۵ — ۴٫۲۴۸	۱۰۰ — ۹۰
درہم بغلی و درہم طبری	۳٫۰۷۷۶ — ۲٫۸۳۲	۸۰ — ۶۰
درہم عتیق، دانق	۱٫۸۸۸ — ۰٫۴۷۲	۴۰ — ۱۰
قیراط، حبہ	۰٫۱۸۸۸ / ۰٫۰۴۷۲	۴

(نظام بنو امیہ)

اوزان اور سکوں کے نام	گرام میں وزن	حبہ میں وزن
مثقال و دینار و درہم عبدالملک	۴٫۲۲ / ۲٫۹۵۲	۸۵ ۵/۷ / ۶۰
دانق زیاد و قیراط عبدالملک	۰٫۴۹۲ / ۰٫۲۱۱	۱۰ / ۴ ۲/۷
قیراط رومانی جدید	۰٫۱۹۶۷	۴
حبہ رومانی جدید	۰٫۰۴۹۲	۱

چنانچہ امیر معاویہؓ کے عہد میں زیاد نے زکوٰۃ کیلئے ایک درہم بنالیا تھا جو رومی جدید نظام کے تحت بنایا گیا تھا کیونکہ اس کا ایک حبہ (۰٫۰۴۹۲ گرام) کے مساوی تھا۔ زیاد نے اس سے (۶۰ حبہ) کا درہم بنایا، جیسا کہ حضرت عمرؓ کا مشہور درہم رومی قدیم حبہ کے وزن سے (۶۰ حبہ) کا ہوتا تھا۔ لیکن امیر معاویہؓ نے زیاد کی بات نہیں مانی۔ لیکن حجاج نے اس مشورہ سے عبدالملک کو مطمئن کر دیا۔ چنانچہ ان دونوں نے اسکو نافذ کر دیا۔ جیسا کہ زکوٰۃ کا دینار نبوت اور خلفائے راشدین کے عہد میں (۴٫۲۵ گرام) تھا مگر ان دونوں نے اسکو کم کر کے (۴٫۲۲ گرام) کر دیا تھا پھر اسکو دس قیراط میں انھوں نے تقسیم کر دیا اور ہر قیراط (۰٫۴۲۲ گرام) کا کر دیا۔ پھر اس دینار کے وزن کو سکوں کے وزن کا معیار قرار دیدیا۔ چنانچہ اسے دونوں ناموں سے پکارتے تھے۔ اسے مثقال بھی کہتے تھے اور دینار بھی کہتے تھے۔ اسی طرح بنو امیہ کا نظام سکہ رومانی قسطنطینی قاعدہ کے بالکل مطابق ہو گیا یعنی سات درہم، مثقال کے برابر ہو گئے یہ دونوں یعنی مثقال اور درہم جو حجاج نے بنائے اس رطل کیلئے وحدت بھی تھے جو بعد میں رطل بغدادی کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ اس مثقال کا وزن (۴٫۲۳ گرام) تھا تو درہم کا وزن اسی کے مطابق (۲٫۹۵ گرام) تھا مگر یہ دونوں درہم اور مثقال وزن اور ناپ کے لئے۔ سکہ کی حیثیت سے مستعمل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سکہ کی حیثیت سے یہ دونوں کبھی نہیں بنائے گئے۔

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سونے کے نصاب پر دو اندازے جاری رہے ہیں (پہلا اندازہ) تو یہ تھا کہ اس کا وزن زمانۂ نبوت اور عہد خلفائے راشدین میں (۲۰ × ۴٫۲۵ = ۸۵ گرام) تھا۔ (دوسرا اندازہ) یہ تھا کہ اس کا وزن زکوٰۃ کے درہم کو کم کر دینے کے بعد (۲۰ × ۴٫۲۲ = ۸۴٫۴ گرام) ہو گیا۔ یہ اندازہ عبدالملک کے عہد سے لیکر تمام بعد کے خلفائے کے عہد میں رہا اور اسی کو ائمۂ اربعہ نے تسلیم کر لیا۔

لیکن چاندی کے نصاب میں مختلف ادوار میں چار اندازے جاری رہے۔

پہلا اندازہ زمانۂ نبوت اور عہد خلافت ابوبکرؓ اور ابتدائے عہد خلافت عمرؓ وصول کنندگانِ زکوٰۃ کو اختیار رہتا تھا کہ وہ دونوں طریقوں پر زکوٰۃ کا نصاب شمار کر سکتے ہیں۔ (پہلا طریقہ) ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ تمام دوسو کے دوسو ، سو تینوں مشہور

اردو ادب میں عظیم نفسیاتی کتابوں کا اضافہ

آپ بھی خوش رہئیے مصنفہ برٹرینڈ رسل مترجمہ شفیع الدین

آج کی دنیا اضطراب و بے چینی کی دنیا ہے۔ ہم طرح طرح کی ذہنی، روحانی اور تخیلاتی اذیتوں کا شکار ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے ان نفسیاتی بیماریوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا علاج تجویز کیا ہے جس پر عمل کرنے سے ہم ان ذہنی بیماریوں سے نجات حاصل کر کے صحت مند تخیل اور خوشی کے جذبات و احساسات سے اپنے دل و دماغ کو لبریز کر سکتے ہیں۔

جب ہمارا دل و دماغ خوشی و مسرت کے جذبات سے معمور ہوگا۔ تو یاس قنوطیت، افسردگی و پژمردگی اور رنج و الم جن کے پہاڑوں تلے ہم برسوں سے سسک رہے ہیں۔ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور ہمارے چاروں طرف مسرت و شادمانی اور کامیابی و کامرانی رقص کرتی ہوئی نظر آئیگی

صفحات ۳۰۶ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ قیمت پانچ روپیہ

سوچئے اور دولت کمائیے مصنفہ نپولین ہل۔ مترجمہ غوث صدیقی ایم۔ اے

یہ کتاب مشہور ماہر نفسیات نپولین ہل کا وہ شاہکار ہے جس نے لاکھوں انسانوں کی ناکام زندگی اور عزت و افلاس کو کامیاب زندگی اور دولت و امارت سے بدل دیا۔

یہ کتاب نہایت قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے انسانی ذہن میں ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو مایوسی اور تاریکی کے جذبات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ترقی کی راہیں کھول دیتی ہے۔ ہر وہ انسان جو اپنی افلاس کی زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کتاب شمع راہ کا کام دیگی

صفحات ۴۰۰ مجلد۔ رنگین گردپوش قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے

نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ کراچی

درہموں میں سے کسی ایک درہم سے شمار کریں (ملاحظہ ہو نقشہ) — (دوسرا طریقہ) ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ تیسرے درہم کو (یعنی نقشہ میں درہم نمبر ۳ کو) نصاب کے شمار کرنے میں معیار قرار دیں۔ یعنی اس طریقہ پر نصاب شمار کریں کہ وہ ہمیشہ (۵۶۶٫۴ گرام) کے وزن کے برابر ہو۔ یعنی پہلی قسم کے درہم سے نصاب شمار کریں تو (۱۵۰ درہم) شمار کریں اور دوسری قسم کے درہم سے (۳۰۰ درہم) شمار کریں اور تیسری قسم کے درہم سے (۲۰۰ درہم) شمار کریں۔

تینوں درہموں سے نصابوں کا نقشہ

نمبر	عدد دراہم نصاب	درہم کا وزن گرام میں	نصاب کا وزن گرام میں
۱	۲۰۰	۳٫۷۷۶	۷۵۵٫۲
۲	۲۰۰	۱٫۸۸۸	۳۷۷٫۶
۳	۲۰۰	۲٫۸۳۲	۵۶۶٫۴

دوسرا اندازہ چاندی کے نصاب کے لئے دوسرا اندازہ حضرت عمرؓ کی آخری خلافت کے زمانہ میں ہوا جبکہ انھوں نے یہ حکم دیدیا کہ زکوٰۃ کی وصولیابی میں صرف دوسری ہی صورت پر عمل کیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تیسرا درہم جس کا وزن (۲٫۸۳۲ گرام) تھا وہ زیادہ تر مستعمل تھا اور اس کا وزن بھی اول اور دوم نمبر کے درہموں کے درمیان تھا یعنی مختلف روایات کے مطابق $\frac{۳٫۷۷۶ + ۱٫۸۸۸}{۲}$ = ۲٫۸۳۲ گرام تھا۔

یا $\frac{۳٫۷۷۶ + ۱٫۸۸۸}{۲} = \frac{۵٫۶۶۴}{۲}$ = ۲٫۸۳۲ گرام تھا حضرت عمرؓ نے عمل میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر نصاب زکوٰۃ اور باقی تمام شرعی معاملات کے لئے اسی تیسرے نمبر کے درہم کو معیار قرار دیدیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تیسرے نمبر کا درہم کا نام ہی درہم عمرؓ پڑ گیا۔

تیسرا اندازہ امیر معاویہ کی خلافت میں جب یہ درہم زیاد کے مشورہ سے (۲٫۸۵ گرام) تک بڑھ گیا جسکی تفصیل پہلے آچکی ہے تو نصاب یوں ہو گیا۔

(۲۰۰ × ۲٫۸۵ = ۵۷۰ گرام)

چوتھا اندازہ عبدالملک کے دور خلافت میں بھی جبکہ درہم (۲٫۹۵۴ گرام) تک بڑھ گیا تو نصاب یوں ہو گیا —

(۲۰۰ × ۲٫۹۵۴ = ۵۹۰٫۸ گرام)

پھر اسی درہم کے مطابق دونوں دور حکومتوں یعنی اموی دور حکومت اور عباسی دور حکومت میں عمل جاری رہا اور ائمہ اربعہ نے بھی اس سے اتفاق کر لیا اور اس کا وزن شرعی درہم کا وزن آج تک یعنی ۱۳۷۴ھ تک برقرار چلا جا رہا ہے۔

اس کے بعد موصوف نے مصر کے مروجہ سکوں اور اوزان سے ان اوزان کی تطبیق دیکر بتایا ہے کہ آج کے مصری سکوں میں ان تبدیلیوں کے مطابق زکوٰۃ کی شرح نصاب کیا ہوگی۔ یہ حصہ چونکہ باشندگان پاکستان کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں تھا اسلئے ہم اسے حذف کر دیتے ہیں۔

امریکہ میں اسلامیات

(ص ۱۲ سے آگے)

موجود ہوں۔ چار پانچ سے زیادہ نہ پڑھ سکیں گے۔ لیکن یہاں کے سینکڑوں کالج اپنے ہاں یقیناً ایسے شعبے کھول دیں گے جن میں مسلمانوں کی تاریخ، عمرانیات یا سیاسیات میں مطالعہ اور ریسرچ کے مواقع موجود ہوں۔

طلوعِ اسلام پروفیسر ہتی کے مندرجہ بالا مضمون سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ امریکہ نے پہلی بار گذشتہ جنگ عظیم میں اس ضرورت کو محسوس کیا کہ مسلمانوں سے روابط بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ امریکہ میں ایسے ادارے اور درسگاہیں قائم کی جائیں جن میں اسلامیات اور عربی زبان کے مطالعہ اور تحقیقات کے اسباب و ذرائع اس فراوانی سے موجود ہوں کہ اسلامی ممالک کے طالب علم اور اسکالر کشاں کشاں اس کی طرف کھنچ کر آجائیں۔ وہ وہاں رہ کر تعلیم بھی حاصل کریں اور ریسرچ بھی کریں۔ اور اس کے بعد پھر اپنے ممالک میں جائیں اور اس طرح یہ چیز امریکہ اور مسلمانوں کے ممالک میں ایک محکم رابطہ کا ذریعہ بن جائے۔ جہاں تک علوم و فنون کے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کا تعلق ہے اور جو قوم اور جو ملک بھی اس باب میں کوئی قدم اٹھائے وہ درخور ہزار تحسین ہے۔ لیکن پروفیسر ہتی نے جو کہا ہے کہ امریکہ میں اسلامیات کا مطالعہ غیر جانبدارانہ انداز سے کرایا جاتا ہے۔ یہ دعوے محل نظر ہے۔ وہ وہاں اس قسم کے اسلام کی ریسرچ کراتے ہیں جو اسلام ان کے مفید مطلب ہوتا ہے۔ پروفیسر ہتی نے کینیڈا کی مک گل یونیورسٹی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے اس یونیورسٹی میں اسلامیات سے متعلق ایک بہت بڑا ادارہ ہے اور یہ ادارہ امریکہ بھر میں سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے کہ اس ادارہ کے نگران پروفیسر اسمتھ، اس مقصد کے لئے مختلف اسلامی ممالک کی سیاحت کے لئے نکلے کہ یہاں سے اچھے اچھے ریسرچ اسکالرز کو اپنی یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دیں۔ ضمناً، پروفیسر اسمتھ وہی ہیں جو ایک عرصہ پہلے لاہور کے مشن کالج میں پڑھاتے تھے اور انھوں نے اُس زمانہ میں اسلام پر ایک کتاب بھی لکھی تھی پروفیسر اسمتھ نے مختلف ممالک کے جن اسکالرز کی فہرست مرتب کر رکھی تھی ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بھی تھا۔ چنانچہ وہ انھیں خاص طور پر ملنے کے لئے کراچی آئے اور ایک تفصیلی ملاقات میں اپنا مقصد بتایا پرویز صاحب نے اسلام کے اس تصور کو ان کے سامنے پیش کیا جو انھوں نے قرآن سے اخذ کیا ہے۔ پروفیسر اسمتھ بڑے خاموشی اور حیرت کے ساتھ سنتے رہے۔ اس سے گہری دلچسپی کا اظہار بھی کیا۔ کئی ایک مقامات پر کچھ نوٹ بھی کیا لیکن اس کے بعد انھوں نے دبی زبان سے کہا کہ اس قسم کے انقلابی اسلام کی ریسرچ ہمارے ادارہ کے لئے موزوں نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس کے برعکس یہ معلوم ہوا ہے کہ اس ادارہ میں جماعت اسلامی کا لٹریچر موجود ہے اور اگر ہماری اطلاع درست ہے، تو کسی صاحب کو لٹریچر ریسرچ کرنے کے لئے متعین بھی کیا گیا ہے۔

ہم نے یہ واقعہ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے درج کیا ہے کہ مغربی ممالک۔ خواہ وہ یورپ ہو یا امریکہ اسلامیات کی طرف خالص علمی نقطہ نگاہ سے توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ یورپ کے سامنے بھی اپنے سیاسی مقاصد تھے اسی طرح امریکہ کے پیش نظر بھی اپنے سیاسی مصالح ہیں اور ان کے حصول کے لئے وہ مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ان سے کہیں کہ وہ اپنے روپیہ سے صحیح اسلام کی ریسرچ کے اسباب و ذرائع بہم پہنچائیں۔ یہ کام تو مسلمانوں کا ہے کہ وہ اپنوں اور بیگانوں، سب تک صحیح اسلام پہنچائیں۔ لیکن۔ ہمارا خیال ہے کہ جب "مسلمانوں" کا نام آگیا ہے تو اس گفتگو کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ مسلمانوں کو صحیح اسلام سے کیا دلچسپی!!

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے
پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے جو پُرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۱ء	مئی تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست، تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔
خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام — کراچی

نقد و نظر

ازدواجی زندگی کیلئے اہم قانونی تجاویز

از مولانا محمد جعفر شاہ صاحب ندوی پھلواروی۔ شائع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔ ضخامت ۱۱۶ صفحات۔ قیمت پندرہ آنے۔

زیر نظر پمفلٹ مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری ندوی رکن ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کا ایک مقالہ ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ ثقافت (از جنوری تا اپریل ۱۹۵۵ء) میں شائع ہو چکا ہے جسے بعد میں مؤلف کی نظرثانی کے بعد ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

زیر نظر مقالہ عائلی اور ازدواجی زندگی سے متعلق بعض اہم اصلاحی تجاویز پر مشتمل ہے اور بحیثیت مجموعی قانون داں اور قانون ساز نیز معیشتی اصلاح کا کام کرنے والے اداروں کی گہری توجہ کا مستحق ہے۔ موصوف نے اپنے مقالہ میں قرآن حدیث اور فقہ کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے۔ اس میں بعض باتیں محل نظر ہیں۔ مثلاً کمسنی کی شادیوں پر بحث کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ

> اس میں شک نہیں کہ مہر میں سے غریب باپ اپنی ضروریات کے لئے کچھ لے سکتا ہے اور کیوں نہ لے جبکہ وہ اسی کی بیٹی ہے جس کی پرورش پر وہ بہت کچھ خرچ کر چکا ہے (ص ۲۵)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے بیٹی کے مہر میں سے باپ کو اپنی ضروریات کے لئے کچھ لے لینے کا جو جواز بتایا ہے وہ لڑکی کے اپنی مرضی سے دینے کی صورت میں ہے یا اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر لے لینے کی صورت میں ہے۔ پہلی صورت تو قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ لڑکی اگر اپنی مرضی سے پورا مہر بھی اپنے باپ یا کسی دوسرے آدمی کو دیدے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر دوسری صورت مراد ہے تو یہ ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ کیونکہ قرآن (بلکہ ہمارا خیال ہے کہ حدیث اور فقہ) کی رو سے مہر محض بیوی کا حق ہوتا ہے۔ اس کے باپ کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اور کوئی باپ اپنی بیٹی کی مرضی کے خلاف اس میں سے ایک حبہ لینے کا بھی حقدار نہیں ہے۔ یہ دلیل کہ باپ نے بیٹی کو پالا ہے۔ اس لئے اسے اس کے مہر میں سے اسکی پرورش کا خرچ لے لینا چاہیئے، بڑی ہی کمزور دلیل ہے۔ یا مثلاً کمسنی کی شادی کے نقصانات و مضرات پر بحث کرتے ہوئے قرآن کریم سے اس نتیجہ پر پہنچ جانے کے بعد کہ شادی کی عمر قرآن کریم نے سن رشد ہی قرار دی ہے۔ موصوف کا یہ فرمانا

> ہاں خاص خاص حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جہاں سن رشد سے پہلے بھی ازدواج کی اجازت دیدی جائے۔ اگر عدالت (سٹی مجسٹریٹ یا تحصیلدار یا جو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے) کے سامنے معقول وجوہ بیان کر دی جائیں۔ اور اسے یقین آ جائے کہ اس رشتہ میں کوئی (EXPLOITATION) نہیں اور زوجین سن شعور تک پہونچنے کے بعد بھی اس فیصلہ پر قائم رہیں گے۔ اور حسن معاشرت سے کام لیں گے۔ تو ہماری رائے یہ ہے کہ اس کی اجازت دیدی جانی چاہیئے۔ (ص ۲۷)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خاص خاص حالات کیا ہو سکتے ہیں جن کی بناء پر کسی لڑکے یا لڑکی کی صغرسنی میں شادی کر دینا ضروری ہو جائے۔ نیز وہ کون سے ذرائع ہو سکتے ہیں جن سے کوئی مجسٹریٹ وغیرہ یہ تعین کر لینے میں حق بجانب ہو کہ زوجین سن شعور تک پہونچنے کے بعد بھی اس فیصلہ پر قائم رہیں گے اور حسن معاشرت سے کام لیں گے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اب تک کوئی ایسی مشین بھی ایجاد نہیں ہو سکی جو یقین کے ساتھ یہ بتلا سکے کہ سن شعور میں پہونچنے کے بعد شادی کرنے والا جوڑا آئندہ بھی اس فیصلہ پر قائم رہے گا۔ اور حسن معاشرت سے کام لے گا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آئے دن باہمی زوجین کے نزاعات اور طلاقوں کی بھرمار کبھی کی بند ہو گئی ہوتی۔ اسی سلسلہ میں ذرا آگے چل کر موصوف نے لکھا ہے کہ

> پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں صغرسنی کی شادی کی نہ کوئی ممانعت ہے۔ نہ حکم۔ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ لہذا یہ فعل مرتبۂ جواز و اباحت میں آتا ہے۔ الخ (ص ۲۷-۲۸)

ہمیں اس ٹکڑے سے قطعاً اختلاف ہے۔ جہاں تک ہم نے قرآن پر غور کیا ہے۔ قرآن کریم صغرسنی کی شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ ایک طرف شادی کی عمر کا تعین کرتے ہوئے بتا دیتا ہے کہ وہ سن رشد ہے۔ دوسری طرف وہ شادی کو طرفین کی پسندیدگی پر چھوڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی سن بلوغ بلکہ سن رشد کے بعد ہی کی معتبر ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں وہ ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ وہاں صراحت سے بتا دیتا ہے

فانکحوا ما طاب لکم من النساء

جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو

اس میں النساء کے لفظ سے صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نکاح انہی سے ہو سکتا ہے جنہیں النساء کہا جا سکتا ہو۔ عربی میں کمسن بچیوں کو النساء نہیں کہتے بلکہ بالغ عورتوں ہی کو کہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں النساء کی تصریح سے مقصد ہی یہ ہے کہ صغرسنی کی شادی کی جڑ کٹ جائے۔ ورنہ من النساء کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی منھن کی ضمیر سے بھی کام چل سکتا تھا۔ نیز قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ اور معاہدہ بلوغت کے بعد ہی قابل قبول پا سکتا ہے۔ ان قرآنی تصریحات کے باوجود موصوف کا یہ فرمانا کہ "قرآن اس بارے میں خاموش ہے لہذا یہ فعل مرتبۂ جواز و اباحت میں آتا ہے"، کم از کم ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

اس کے بعد طلاق کے سلسلہ میں متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان تمام تجاویز کے بجائے اگر صرف یہ ایک تجویز رکھدی جاتی کہ طلاق دینے کا حق افراد کو نہیں ہونا چاہیئے بلکہ عدالت کو ہونا چاہیئے تو وہ قرآن سے زیادہ قریب ہوتی قرآن کریم نے طلاق کے سلسلہ میں عموماً جمع کے صیغے استعمال کر کے معاشرہ کو مخاطب کیا ہے۔ نہ کہ فرد کو۔ اس کے علاوہ اس میں اور تصریحات بھی ایسی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ معاملہ معاشرے کے طے کرنے کا ہے نہ کہ فرد کا محض از خود۔ لہذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے یہ حق معاشرہ کی کسی ہیئت انتظامیہ کو ہونا چاہیئے کہ جب وہ دیکھے کہ زوجین میں نباہ کی کوئی صورت ممکن نہیں رہی تو طلاق واقع کر دے۔ اس ایک تجویز سے ان تمام مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے جو ہمارے معاشرے کو گندہ کئے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسا نظر آتا ہے کہ محترم مؤلف کے ذہن میں ایک سے زیادہ طلاقوں کی قرآنی صورت بھی صاف طور پر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ طلاق سہ گانہ بیک مجلس کی بحث میں الجھ گئے ہیں جہاں تک ہمیں بصیرت کا تعلق ہے قرآنی طلاقوں کی صورت ایک مجلس یا دو مجلسوں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ وہ پوری عائلی زندگی میں تین مرتبہ طلاق تک نوبت پہنچ جانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ایک مرتبہ طلاق دیدی اور رجوع یا نکاح ثانی کر لیا گیا۔ پھر عرصہ کے بعد دوسری بار طلاق دیدی گئی اور رجوع یا نکاح ثانی کر لیا گیا۔ ایسے ہی ایک عرصہ کے بعد پھر تیسری مرتبہ طلاق دیدی گئی تو اب رجوع یا نکاح نہیں ہو سکے گا۔

اس کے بعد تعدد ازدواج کے مسئلہ پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور موصوف نے اسی رائے کو اپنایا ہے کہ قرآن کریم نے تعدد ازدواج کی اجازت صرف ہنگامی حالات میں ہی دی ہے۔ عام حالات میں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن آخر میں موصوف نے قانونی تجاویز پیش کرتے ہوئے یہ بھی لکھدیا ہے کہ

> ہمارے خیال میں تعدد ازدواج کی اجازت کو مندرجہ ذیل قانونی شرائط سے وابستہ کر دینا چاہیئے۔
>
> (۱) شادی کے سات سال (یا جو مناسب مدت سمجھی جائے) بعد تک باوجود علاج معالجے کے اولاد نہ ہو۔ یا وہ ایسی مریضہ ہو جو علاج معالجے کے باوجود حقوق زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہو۔
>
> (۲) شوہر کے پاس اتنی کافی مالیت ہو کہ وہ دوسری بیوی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات زندگی کی بحسن و خوبی کفالت کر سکتا ہو اور پہلی بیوی اور اولاد کی ضروریات کی کفالت میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

(۳) پہلی بیوی بخوشی اس کی اجازت دے یا دوسری شادی کے اسباب عدالت کے نزدیک قابل قبول ہوں۔

یعنی ان شرائط کے ساتھ موصوف کا خیال ہے کہ مردوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ لیکن ان شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت کے متعلق قرآن میں ہمیں کوئی اشارہ ملتا نہیں۔ قرآن صرف ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیتا ہے اور بس۔ قرآن تو ایک طرف، ہمیں تو احادیث رسول میں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جس سے سمجھا جائے کہ ان شرائط کے ساتھ ایک سے [illegible] شادیاں کر لینے کی اجازت ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلعم نے نو شادیاں کی تھیں مگر آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ میں فلاں شادی اس لئے کر رہا ہوں کہ پچھلی بیویوں سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ یا میرے پاس اتنا مال ہے کہ میں ہونے والی بیوی یا اس کی اولاد کی بسہولت کفالت کر سکتا ہوں۔ اور پچھلی بیویوں کی کفالت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یا پچھلی بیویوں نے مجھے بخوشی ایسا کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ نہ ہی آپ نے اپنے صحابہ میں سے کسی کو ان شرائط کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس لئے ہم نہیں سمجھ سکے کہ موصوف نے ان شرائط کے ساتھ نکاح ثانی کا جواز کیسے درست قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک تعدد ازدواج کی اجازت انہی ہنگامی حالات میں ہو سکتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے خود کر دیا ہے کہ جنگ یا کسی اور وجہ سے معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں کی اس قدر کثرت ہو جائے کہ معاشرہ ان کی پرورش اور تربیت کا انتظام مناسب اور معقول (بالقسط) طریقہ پر نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ایسی نہیں جس میں قرآن تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے۔ رسول اللہ صلعم اور صحابہ کے عہد میں اس قسم کے ہنگامی حالات موجود تھے۔ اور اس بنیاد پر ان حضرات نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ اب اگر کسی وقت اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو ملت کی ہیئت انتظامیہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن عام حالات میں کسی شرط کے ساتھ بھی تعدد ازدواج کی اجازت دینا ہمارے نزدیک قرآن کے خلاف ہے۔

بہر حال اس قسم کے چند مقامات ہیں جہاں ہمیں محترم مصنف سے اختلاف ہے۔ اگر ان مقامات کی اصلاح کر دی جائے تو ہمارے نزدیک موصوف کی پیش کردہ قانونی تجاویز عمدہ نتائج کی حامل ہو سکتی ہیں اور ان سے امید کی جا سکتی ہے کہ ہماری عائلی زندگی جہنم بننے سے بچ جائے۔

ہمیں محترم جعفر شاہ صاحب کی تحریروں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ ان کی فکر کا رخ تو صحیح سمت کی طرف ہوتا ہے لیکن قرآن کی دو ٹوک بات کہنے میں کوئی بات ان کی عنان گیر ہو جاتی ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس کشمکش سے جلدی نکل جائیں اور قرآن کی بات دو ٹوک کہنے کے قابل ہو جائیں کہ یہی دین قیم ہے۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد بمعہ گردپوش ——— قیمت — بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق (قصہ آدم)۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات ——— قیمت — آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت ——— چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات قیمت — چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ۔ ۱۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۳۰ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظام ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دور حاضر کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول ——— چھ روپے۔ قسم دوم (غیر مجلد) ——— چار روپے۔

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ ——— قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

حقائق و عبر

ابلہ فریبیاں

جیسا کہ ہم اس سے پہلے کئی بار لکھ چکے ہیں، بدقسمتی سے ہمارے ہاں "اقامت دین" کے علمبرداروں کا انداز یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ بولا جائے۔ مغالطہ دیا جائے۔ مبہم الفاظ استعمال کئے جائیں۔ مختلف حربوں سے فضا میں اس قسم کے اثرات پیدا کئے جائیں جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ دین، علم، فکر، اسلام کا درد ملت کی بہبود، سب سمٹ سمٹا کر انہی حضرات کے دل و دماغ میں آ چکے ہیں، اور ان سے باہر جتنے لوگ بستے ہیں، وہ جاہل ہیں اور بے ایمان بھی۔ فکر و شعور سے عاری بھی ہیں اور بددیانت بھی اس کی تازہ مثال ہمیں جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اس تقریر میں ملتی ہے جو انھوں نے حال ہی میں کراچی میں وکلاء کے سامنے ارشاد فرمائی۔ اس اجتماع کے متعلق بھی باہر کی دنیا کو ایسا اندازہ دیا گیا گویا یہ کراچی کی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے اجتماع ہوا تھا۔ حالانکہ ہماری معلومات کے مطابق یہ صرف ایک نجی سا اجتماع تھا جس میں زیادہ تر ان ہی کے مداحین لائے ہوئے تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سب سے پہلے گوشہ چشم گورنر جنرل کی طرف دا فرمایا (ضمناً چونکہ مودودی صاحب کی گرفتاری وغیرہ غلام محمد صاحب کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ اور ان کی جماعت اُس وقت سے اس وقت تک ان کے پیچھے لٹھ لئے پھر رہی ہے) چنانچہ مودودی صاحب نے فرمایا کہ

> اگر ساری قوم مل کر بھی کوئی دستور بنائے تو وہ نافذ نہیں ہو سکتا جب تک ایک بیرونی ملک کی ملکہ کا نمائندہ اس کی منظوری نہ دے۔۔۔۔۔
>
> گویا ہماری قسمت منحصر ہو گئی ہے ایک شخص واحد کے اشارہ چشم و ابرو پر اور وہ شخص بہرحال ایک غیر ملک کا نمائندہ ہے۔ اس ملک کا جس نے آٹھ سال پہلے خود ہمیں آزادی دی تھی۔ اب آٹھ سال کے بعد ہم نے خود اس سے درخواست کی ہے کہ ہم آزادی کے قابل نہیں ہیں۔ ہم آپ کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور ہم ان ہدایات پر چلیں گے جو آپ کا نمائندہ ہو گا۔

(جنگ - ۱۰؍اگست ۱۹۵۵ء)

یعنی مودودی صاحب نے اس حقیقت کبریٰ کا انکشاف فرمایا کہ پاکستان کا گورنر جنرل انگلستان کی ملکہ کا نمائندہ ہے۔ ہم پاکستان کے ارباب سیاست سے پوچھتے ہیں کہ کیا گورنر جنرل کی واقعی یہی پوزیشن ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ہمارا اپنا کانسٹی ٹیوشن نہیں بن جاتا۔ گورنر جنرل کے تقرر کے لئے انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ سے استصواب ضروری ہے۔ لیکن اس سے وہ انگلستان یا وہاں کی ملکہ کا نمائندہ کس طرح بن گیا؟ اس کا انتخاب اسی ملک میں ہوتا ہے۔ اس ملک کے نمائندے اس کی تعیناتی کی سفارش کرتے ہیں۔ انگلستان کے حاکم اعلیٰ کی منظوری محض ایک رسم (FORMALITY) کے طریق پر حاصل کی جاتی ہے۔ نہ اسے وہاں سے کوئی ہدایات ملتی ہیں جنھیں وہ یہاں نافذ کرتا ہے نہ ہی وہ یہاں اُس ملک کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی پوزیشن آٹھ سال پہلے تھی۔ اور یہی پوزیشن آج ہے۔ اب لوگوں سے یہ کہنا کہ پاکستان کا گورنر جنرل انگلستان کی ملکہ کا نمائندہ بن گیا ہے اور یہ اس سے ہدایات لے کر یہاں نافذ کرتا ہے۔ یا تو انتہائی جہالت کا مظاہرہ ہے یا پھر دانستہ بددیانتی کا۔

(۲) آگے چل کر انھوں نے فرمایا کہ

> ملک میں دستور صرف وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی مرضی اور تمناؤں کے مطابق ہو۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار بتا چکے ہیں۔ تحریک پاکستان کے زمانہ میں جب مودودی صاحب سے کہا جاتا کہ پاکستان کا مطالبہ ملک کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی مرضی اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ اس لئے اس مطالبہ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔ تو یہ ایک نہایت استخفاف آمیز ہنسی سے فرمایا کرتے کہ مسلمانوں کی اکثریت تو بھیڑوں کی اکثریت ہے ان میں سے فی ہزار ۹۹۹ مسلمان ہیں نہ کوئی اپنی رائے رکھتے ہیں لہٰذا ان کی بات کا وزن کیا؟ لیکن اب یہ اٹھتے بیٹھتے دہرائے چلے جا رہے ہیں کہ صحیح اسلامی دستور وہی ہو گا جو انہی مسلمانوں کی اکثریت کی مرضی اور تمناؤں کا مظہر ہو۔

اسے بھی چھوڑیئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت کی مرضی اور تمنا ماپنے کا پیمانہ کیا ہے۔ جمہوری انداز حکومت کے معنی ہوتے ہیں لوگوں کی منشاء کے مطابق حکومت۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کی منشاء (WILL OF THE PEOPLE) کو معلوم کیسے کیا جائے؟ جمہوریت پسندوں نے اس مقصد کے لئے ایک مشینری وضع کی ہے۔ جس سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اکثریت کیا چاہتی ہے۔ وہ مشینری یہ ہے کہ ملک کے باشندے اپنے نمائندے چنتے ہیں۔ نمائندے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان کی اکثریت جو فیصلہ کرتی ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ ملک کی اکثریت کا فیصلہ ہے۔ اس مشینری کے مطابق پاکستان میں ملک کے نمائندوں کا انتخاب ہوا (یہ الگ بات ہے کہ اس انتخاب میں بدعنوانیاں ہوئیں یا نہیں) یہ منتخب شدہ نمائندے صوبوں کی اسمبلیوں میں اور مرکز کی مجلس دستور ساز میں جمع ہیں۔ آئین جمہوریت کی رو سے ان نمائندوں کی اکثریت جو فیصلہ کرے گی اسے ملک میں بسنے والوں کی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کیا جائے گا۔ جمہوری انداز حکومت میں اکثریت کی مرضی معلوم کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

لیکن مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ ملک کے نمائندوں کی اکثریت جو فیصلہ کرے گی اسے ملک کے بسنے والوں کی مرضی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مرضی معلوم کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے پوچھو۔ یعنی اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اگر رسول اللہؐ زندہ ہوتے تو فلاں معاملہ میں آپ کیا فیصلہ فرماتے؟ تو آپ مودودی صاحب سے پوچھیں۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ پاکستان کے آٹھ کروڑ باشندوں کی مرضی کیا ہے تو اس کے لئے بھی مودودی صاحب سے پوچھیں۔ اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ خود اللہ میاں کی مرضی کیا ہے تو آپ یہ بھی انہی سے پوچھیں۔

(۳) آپ فرماتے ہیں کہ ملک کی اکثریت کی مرضی یہ ہے کہ یہاں اسلامی آئین نافذ ہو۔ ہم ان سے پوچھتے یہ ہیں کہ کیا مجلس دستور ساز کے ممبروں میں سے کسی نے آج تک یہ بھی کہا ہے کہ ہمارا دستور اسلامی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ غیر اسلامی ہونا چاہیئے؟ جب وہ بھی یہی کہتے ہیں تو پھر آپ کے اس شور و غوغا کا مفہوم کیا ہے کہ ملک میں اسلامی دستور ہونا چاہیئے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اسلامی دستور کہتے کسے ہیں؟ سو اس کے متعلق نہ آج تک آپ نے کوئی وضاحت کی ہے اور نہ ان لوگوں نے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ

> قرآن و سنت کو سرچشمۂ ہدایت اور اولین ماخذ قانون تسلیم کیا جائے اور قرآن و سنت کے خلاف ہر قسم کی قانون سازی ممنوع ہو۔

ان مطالبات کے متعلق پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے پہلی چیز قرارداد مقاصد کے اندر موجود ہے۔ اور دوسری چیز بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں موجود تھی جو انھوں نے سابقہ اسمبلی کے سامنے پیش کی تھی۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ وہ کونسی چیز ہے جس کا مطالبہ مودودی صاحب فرما رہے ہیں۔ ان کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ مالی معاملات کو ۲۵ سال تک کے لئے آئین سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ اس کے متعلق خود مودودی صاحب اپنی تقریر میں فرماتے ہیں کہ

> میں یہ نہیں کہتا کہ جونہی اسلامی دستور نافذ ہو تمام مالی معاملات پر اس کا اطلاق ہو جائے۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ اس قسم کا کام یک لخت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کی سفارش اس رپورٹ میں کی گئی تھی اس فرق کے ساتھ کہ اس میں ۲۵ سال کی مدت کا تعین کر دیا گیا تھا اور مودودی صاحب نے اسے (حسب عادت) بلاتعین چھوڑ دیا ہے۔ اس کی بابت ان کی تجویز یہ ہے کہ ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے۔ اور اس کی رپورٹ کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ کمیشن مقرر کرنے کی تجویز بھی اس رپورٹ میں موجود تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ رپورٹ میں ۲۵ سال کے بعد کمیشن مقرر کرنے کی تجویز تھی۔ اور مودودی صاحب ساتھ کے ساتھ کمیشن مقرر کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ یہ کونسا اتنا بڑا فرق ہے جس کی بنا پر یہ شور مچایا جائے کہ اسلامی

دستور کے داعی بھی ہیں۔ یہ لوگ اسلامی دستور نہیں چاہتے اور پھر یہ بھی سوچئے کہ فرض کیجئے مودودی صاحب کے تجویز کے مطابق متعین کردہ کمیشن یہ فیصلہ دے دے کہ مالی معاملات کو ۵۰ سال تک اسلامی آئین سے مستثنےٰ رکھا جائے تو کیا یہ چیز اسلام کے مطابق ہو جائے گی؟

(۲) آپ نے غور فرمایا کہ اس تقریر میں بھی اہل ملک کو کس طرح مغالطے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی لوگوں سے کہا گیا ہے کہ یہ گورنر جنرل انگریزوں کا نمائندہ ہے۔ ان سے ہدایات حاصل کرتا ہے۔ ملک کی آبادی کا تقاضا اسلامی دستور کا نفاذ ہے۔ لیکن ارباب لبست وکشاد اور مجلس قانون ساز کے اراکین اس کے خلاف ہیں اور صرف ہماری جماعت ہے جو اسلامی آئین کے نفاذ کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اس لئے

"یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم پورے شعور کے ساتھ پورے اتحاد اور عزم کے ساتھ اس کی کوشش کریں اور دستور ساز اسمبلی پر پوری قوت سے اس مقصد کے لئے دباؤ ڈالیں۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اسمبلی کے اراکین خود یہ کہتے ہیں کہ ملک کا دستور اسلامی دستور ہونا چاہیئے تو پھر ملک کے باشندوں کو اکسانا کہ تم ان پر دباؤ ڈالو، کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسلامی دستور صرف وہی ہوگا جسے مودودی صاحب اسلامی قرار دیدیں۔ ملک کو اس بات کے لئے دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ مودودی صاحب کے منشار کے مطابق آئین بنایا جائے گورنر جنرل ہو یا مجلس دستور ساز۔ لیڈر ہوں یا حکومت کے ارکان۔ ہمیں ان میں سے نہ کسی کی وکالت مقصود ہے نہ حمایت۔ ان میں سے جو بھی صحیح راستے سے ہٹے ہم سب سے پہلے اس کے مخالف ہیں۔ زیر نظر تجزیہ سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ جو اپنے مفاد کی خاطر ملک میں انتشار پیدا کر رہے ہیں لوگوں کو کس طرح فریب دیتے ہیں۔ اس باب میں ہمیں مودودی صاحب پر چنداں افسوس نہیں۔ جہاں تک آئینی معاملات کے سمجھنے کا تعلق ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے ان کے سامنے اپنے چند مفاد ہیں جن کے لئے وہ ہر قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں ملک کے لکھے پڑھے طبقہ کے سامنے کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اٹھ کر یہ نہیں کہتا کہ آپ ایسے اہم معاملات میں ذرا سوچ سمجھ کر بات کیجئے۔ ان کی مذکورہ بالا تقریر وکلا کے طبقے کے سامنے ہوئی۔ ہم ان کے ان مخاطبین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے نمائندے نے مودودی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو یہ فرمایا کہ

"مولانا موصوف اس عہد کے ایک بہت بڑے مفکر اور اس ملک کے ایک بہت بڑے رہنما ہیں۔"

تو کیا آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ خود آپ کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ اللہ حافظ ہے اس قوم کا جس میں اس قسم کے مفکر ہوں اور ان مفکرین کے اس قسم کے ستائش گر۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

پاکستانی سکھ

جب حکومت ہند نے ۱۹۳۲ء میں ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب کے احکام جاری کئے تو ان کی رُو سے سکھوں کے لئے الگ آسامیاں مخصوص کر دی گئیں تھیں لیکن جب ان احکام کو عمل میں لایا گیا تو سکھوں کے متعلق ایک عجیب دشواری پیش آئی۔ اگر حکومت کسی اسامی پر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے کسی طرفدار سکھ کو متعین کرتی تو اکالی دَل والوں کی طرف سے اعتراض ہو جاتا کہ وہ شخص اصلی سکھ نہیں مجاپاتی ہے اور اگر کسی آسامی پر اکالی دَل کے طرفدار سکھ کی تعیناتی ہو جاتی تو پربندھک کمیٹی والے اعتراض کر دیتے کہ وہ اصلی سکھ نہیں۔ نباسپتی ہے۔ حکومت کو اس میں بڑی دشواری پیش آتی۔ اسمبلی میں اکثر سوالات ہوتے کہ سکھوں کے لئے مخصوص اسامیوں پر کس کس امیدوار کی تعیناتی ہوئی ہے اور جب ان کی فہرست پیش ہوتی۔ تو ان میں سے بعض کے متعلق سکھوں کی ایک پارٹی کہہ دیتی کہ وہ سکھ نہیں اور بعض کے متعلق دوسری پارٹی اعتراض کر دیتی۔ پانچ چھ برس تک حکومت ان کا منہ تکتی رہی لیکن بالآخر تنگ آکر اس نے سکھوں کی ان تمام پارٹیوں سے کہا کہ وہ مہربانی کر کے سر جوڑ کر بیٹھیں اور متفقہ طور پر حکومت کو بتا دیں کہ سکھ کسے کہتے ہیں اور اس کے جانچنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں امیدوار سکھ ہے یا نہیں۔ اس پر سکھ مطمئن ہو گئے۔ لیکن ۱۹۴۷ء تک وہ کوئی ایسا متفقہ فارمولا وضع نہیں کر سکے جو سکھ کو پہچاننے کے لئے کسوٹی کا کام دے۔ اس کے بعد غالباً وہاں کی حکومت نے فرقہ وارانہ تناسب ہی کو ختم کر دیا۔ جس کی وجہ سے سکھوں کو اس گتھی کو سلجھانے سے خود بخود نجات مل گئی۔

ہم سمجھتے تھے کہ اس قسم کی باتیں سکھوں ہی سے مخصوص تھیں اور پاکستان میں اب سکھ نہیں رہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہاں بھی سکھ موجود ہیں۔ اور انہیں بھی اس قسم کے مسائل پریشان کر رہے ہیں۔ اس کی تازہ نظیر گورنر جنرل میجر جنرل اسکندر مرزا کی تعیناتی ہے۔ ان کے متعلق متحدہ محاذ کے لیڈر مولوی فضل الحق صاحب نے بیانگ دہل (یعنی ریڈیو پر) اعلان کیا کہ وہ بنگالی ہیں اور خالص بنگالی۔ اور بنگالی بھی معمولی درجہ کے نہیں بلکہ ان کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے (یعنی وہ کشمیری بازار لاہور کے تاجران کتب کی اصطلاح میں اصلی تے وڈھی ہیر وارث شاہ کے کینڈے کے بنگالی ہیں) لوگوں کو اطمینان ہو گیا کہ اتنی بڑی سند کے بعد اب گورنر جنرل کے بنگالی ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اب کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی دوسری بنگالی پارٹی کے ایک ممتاز لیڈر (یعنی عوامی لیگ کے سکرٹری شیخ مجیب الرحمٰن صاحب) کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب بنگالی نہیں ہیں اگر وہ بنگالی ہوتے تو ہم مطمئن ہو جاتے۔

ان دونوں پارٹیوں کی طرف سے اعلانات کی ضرورت اس لئے پڑی کہ کنونیشن یہ ہے کہ اگر گورنر جنرل بنگالی ہو تو وزیر اعظم مغربی پاکستان کا باشندہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر گورنر جنرل مغربی پاکستان کا ہو تو وزیر اعظم کو بنگالی ہونا چاہیئے۔ مولوی فضل الحق صاحب اس کیبنٹ کے وزیر ہیں جس کے وزیر اعظم (چودھری محمد علی صاحب) مغربی پاکستان کے رہنے والے ہیں اس کے لئے ضروری تھا کہ میجر جنرل اسکندر مرزا کو بنگالی ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف عوامی لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ سہروردی صاحب کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ اور یہ مطالبہ اسی صورت میں حق بجانب قرار پا سکتا ہے کہ گورنر جنرل صاحب کو غیر بنگالی ثابت کیا جائے۔ لیکن عوامی لیگ والوں نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ اگر مولوی فضل الحق صاحب نے یہ کہہ دیا کہ مسٹر سہروردی کہاں کے بنگالی ہیں۔ تو اس کا جواب کیا ہوگا؟

اور مولوی فضل الحق صاحب اور عوامی لیگ والے، دونوں وہ ہیں جو اپنے ہر جلسہ کا آغاز قرآن کی تلاوت سے کرتے ہیں۔ پاکستان کا آئین قرآن وسنت کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ اور یہاں اسلام کے اقدار کو نافذ کرنے کا درد اپنے سینہ میں لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس اسلام کا درد جس کی رو سے بنگالی اور غیر بنگالی مسلمان کی تمیز زمانہ جاہلیت کی یادگار لہٰذا کفر ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ پستی اور تضاد کی اس حد تک تو سکھ بھی کبھی نہیں پہونچے ہوں گے! لیکن اس میں عوامی لیگ اور متحدہ محاذ ہی کی خصوصیت نہیں۔ این خانہ ہمہ آفتاب است لیاقت علی خاں مرحوم نے پاکستان کی ملازمتوں میں صوبہ وارانہ تناسب کے اصول کو جاری کیا۔ اور اس طرح پاکستان کے مسلمانوں کو بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی، سرحدی کی غیر اسلامی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ یہی قانون خواجہ ناظم الدین کی وزارت میں بھی جاری رہا۔ محمد علی صاحب نے بھی اسے علیٰ حالہٖ رکھا اور اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان ہی بنیادوں پر اس کنونشن کی بھی عمارت اٹھی کہ وزیر اعظم اگر بنگالی ہو تو گورنر جنرل کو غیر بنگالی ہونا چاہیئے۔ اور اس کے باوجود لیاقت علیخاں مرحوم۔ خواجہ ناظم الدین۔ اور محمد علی صاحب سب اسلام کے جانثار اور پاکستان میں اسلامی آئیڈیالوجی کے علمبردار بنتے رہے اور تسلیم کئے جاتے رہے نہ ان میں سے کسی کے دل میں خیال آیا کہ ہم اسلام کا نام لے کر یہ غیر اسلامی تفریق کس طرح رائج کر رہے ہیں۔ اور نہ ہی اس قوم نے انہیں روکا اور ٹوکا کہ آپ یا اسلام کا نام نہ لیں اور اگر اسلام کا نام لیتے ہیں تو اس قسم کے غیر اسلامی امتیازات کو مٹائیے۔ چنانچہ ان ہی امتیازات کا نتیجہ ہے کہ اب یہ تفریق امٹ ہو چکی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ملک پر جو تباہیاں آئی ہیں۔ وہ سب پر روشن ہیں۔ اور یہ لکیریں دلوں میں اس درجہ گہری جا چکی ہیں کہ ان کے مٹانے کے لئے اگر مغربی پاکستان کی وحدت کی تجویز کی جاتی ہے تو اس کی مخالفت بھی مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ کی ڈاک

قاہرہ کے ایک ہفتہ وار عربی رسالہ المصور کے بیان کے مطابق مشہور فقیہہ اور شافعی مسلک کے بانی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نام روزانہ تقریباً پانچسو خطوط بذریعہ ڈاک

اور تقریباً ایک ہزار ذستی امام مرحوم کے مزار شریف پر جو قاہرہ کے محلہ "امام" میں واقع ہے پہونچتے ہیں۔

ان خطوط کے ذریعہ لوگ مختلف شرعی مسائل اور زندگی کے دوسرے معاملات میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے فتاوی طلب کرنے کے علاوہ مختلف مرادیں بھی مانگتے ہیں۔ بعض خطوط کے بھیجنے والے خطوط میں لکھے ہوئے معاملات کی صحت کی تصدیق کے لئے اپنے نام کے ساتھ ساتھ دوسرے گواہوں کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان بھی ثبت کر دیتے ہیں واضح رہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو قریب بارہ سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔

مزار شریف کے نگران شیخ علی محسن نے ان خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت اور علماء کا فرض ہے کہ وہ اس مصیبت سے انہیں نجات دلائیں۔

مرادیں مانگنا اور وہ بھی اہل حدیث کے اتنے بڑے امام کے مزار سے، اسے تو چھوڑیئے امام صاحب سے فتاوی طلب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام صاحب زندہ ہیں یا ان کی وفات کو قریب بارہ سو برس ہونے کو آئے ہیں۔

یہ ہے ہماری قوم کی حالت!

کون سچا ہے؟

کراچی میں حال ہی میں، جمعیت اسلامی طلباء کے زیر اہتمام وائی ایم سی اے ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب نے تقریر فرمائی۔ جلسہ کے صدر مسٹر بروہی تھے۔ نوائے پاکستان کی رپورٹ کے مطابق صاحب صدر نے

> مولانا مودودی کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست بازی کو چھوڑ کر طلباء اور نئی پود کی اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ ۔ ۔ ۔ نیز فرمایا کہ اگر پاکستان میں صرف چھ بلکہ تین آدمی بھی ایسے مل جائیں جنہیں ہم صحیح رنگ میں اسلام کا نمونہ قرار دے سکیں تو ہم انہیں مثال کے طور پر دوسرے مذہب والوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں تو اسلام پر صحیح رنگ میں عمل کرنے والے ملتے ہی نہیں۔ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ عمل کچھ نہیں۔
>
> (نوائے پاکستان ۲۳/۸/۵۵)

لیکن اسی جلسے کے متعلق جماعت اسلامی کے ترجمان تسنیم (بابت ۲۳/۸/۵۵) میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

> مسٹر بروہی نے مولانا مودودی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ایک عظیم اسکالر اور بلند پایہ مفکر ہیں اور میں اس تجزیے سے جو ابھی انھوں نے کیا ہے مکمل اتفاق رکھتا ہوں۔

ہند و استعماریت

(صفحہ ۵ سے آگے)

کو آزاد کرانے کے لئے پر امن تحریک چلائے۔ یقیناً پنڈت جی اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔

ہم اس سلسلہ میں اپنے ارباب حکومت سے ایک گذارش ضروری سمجھتے ہیں۔ طلوع اسلام کے صفحات پر متعدد مرتبہ دلائل و شواہد سے بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان کس طرح ہند و استعماریت کا علمبردار بنتا جا رہا ہے اور یہ استعماریت کس طرح دیگر اقوام کے علاوہ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم الشان خطرہ ہے۔ مسلمانان ہندوستان کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا۔ جونا گڈھ، مانا ودر اور مانگرول کو جس طرح غصب کیا گیا، حیدر آباد پر جیسے یلغار کر دی گئی اور کشمیر کو جس انداز سے فوجی تسلط میں لیا گیا یہ سب اسی ایک نکتہ کی تفسیر ہے۔ ان سب میں نشانہ مسلمان اور پاکستانی تھے۔ وہی در اصل ہندوؤں کے حقیقی دشمن ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ پاکستان میں اس خطرے کو کسی قدر نہیں سمجھا گیا اور قائدین ہندوستان کے متعلق ایک طرح کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں جس کا مظاہرہ آئے روز ہوتا رہتا ہے۔ اس کا تازہ اور انتہائی ضرر رساں مظاہرے سابق وزیر اعظم اور راجہ غضنفر علی خاں کے بیانات ہیں۔ دونوں میں پنڈت نہرو کو یہ سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں اصول پسند ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ دیتے وقت یہ بھلا دیا گیا کہ سات سال تک کشمیر میں پنڈت جی کا رویہ کیسا رہا ہے۔ آپ حقائق کے علی الرغم پنڈت جی سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں تو شوق سے رکھئے لیکن اب قوم سے یہ توقع نہ کیجئے کہ وہ کشمیر کے بارے میں آپ کی پالیسی صاد کرتی رہے گی۔ اسے پنڈت نہرو نے راہ عمل سمجھا دی ہے۔ آپ خدا کے لئے اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوں۔ آپ ایک طرف ہو جائیے اور اپنی کرسیوں کی خیر منائیے اور قوم کو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ از خود حل کر لینے دیجئے۔

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراج انسانیت ۔۔۔۔ ۲۵ فی صدی، دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی

(۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی۔ (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔ (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے بعد وضع کمیشن سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی

نوٹ:۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۲ کراچی

ابلیس و آدم

سب سے پہلا انسان کس طرح معرض وجود میں آیا؟ آدم اور خلافت آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس کیا ہے اور آویزش ابلیس و آدم کیا؟ وحی کیا ہے اور وحی نے انسان کو کیا عطا کیا؟ ان سوالات کے قرآنی جوابات اس کتاب میں دیکھئے۔

صفحات ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

اقبال اور قرآن

اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا۔
قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے؟

ان کے جوابات مفسر قرآن اور ترجمان اقبال پرویز سے سنئے۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت حصہ اول (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے۔
قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائینگے۔

دور حاضرہ کی عظیم کتاب

✡ نظام ربوبیت ✡

(از - پرویز)

ھاتھوں ھاتھ فروخت ھورھی ھے۔ اس میں بتایا گیا ھے کہ قرآن کی رو سے اس زمین پر انسان کے سب سے اھم سوال - یعنی

معاشی مسلئہ

کا حل کیا ھے۔ انسانی عقل اس کے حل سے کس طرح قاصر رھی ھے اور وحی خداوندی نے اسے کس خوبصورتی سے حل کردیا ھے رزق کے سر چشموں پر

ذاتی ملکیت

کیا نتائج پیدا کرتی ھے اور قرآن اس باب میں کیا کہتا ھے۔ چونکہ اس کتاب کی عام اشاعت مقصود ھے اس لئے اسے دو قسموں میں شائع کیا گیا ھے۔

قسم اول۔ کاغذ سفید کرنا فلی۔ جلد مضبوط مع گرد پوش چھ روپے۔

قسم دوم۔ کاغذ میکانیکل۔ صرف ڈسٹ کور کے ساتھ چار روپے۔

دونوں صورتوں میں محصول ڈاک الگ ھے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ے - کراچی-۳

Title Printed at Musid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM